مارچ

المنار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وممن خلقنا امۃ یھدون بالحق وبہ یعدلون

(قرآن کریم سورۃ اعراف)

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

علم

نگران

محمد شریف خالد ایم۔ اے

و

مدیر اعلیٰ

کلیم اللہ خان

نائبین

مرزا محمد الیاس

ارشد ترمذی

عمل

جلد ۱۱ ــــ مارچ سنہ ۱۹۶۱ء ــــ شمارہ ۵

پرنٹر و پبلشر:- اے۔ آر۔ [illegible] ہاشمی ۔ مطبع:- ضیاء الاسلام پریس ـ ربوہ

حصہ انگریزی لطیف آرٹ پریس ربوہ میں چھپا:

ترتیب

اداریہ	میرزا محمد الیاس	۳
توحید کامل	پروفیسر بشارت الرحمٰن ایم۔ اے	۵
پرواز تخیل	عطاء المجیب راشد	۷
غزل	نعیم قدسی	۱۲
عمر خیام کی چند رباعیات	پروفیسر حمید الدین ایم۔ اے	۱۳
"تاثرات"	لطف الرحمٰن محمود	۱۶
"ظلم سے کر توبہ"	رحمٰن پرویز	۲۱
مسلمانوں کا علوم فلکیات میں حصہ	عبد الشکور اسلم	۲۳
"نقد و نظر"	کوہستانی	۲۹
غزل	انور شاہ ارشد	۳۲
غزل	خلیل رامپوری	۳۳
غزل	لطف الرحمٰن محمود	۳۴
"قیدی"	پروفیسر محمد شریف خالد ایم۔ اے	۳۵
غزل	پروفیسر نصیر احمد خان ایم۔ ایس سی	۳۶
امام الکلام	حضرت مسیح موعود علیہ السلام	۳۷
کلام الامام	حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ الودود	۳۸
غزل	شیخ روشن دین تنویر	۳۹
"نئی زمین ......"	جناب قاضی محمد ظہور الدین اکمل	۴۰

میرزا محمد الیاس

اداریہ

ٹائم ٹیبل اور رمضان المبارک

رمضان المبارک کے جہاں اور بہت سے فوائد ہیں وہاں ایک بڑا فائدہ جو طلباء کو خاص طور پر پہنچا ہے وہ ہے ٹائم ٹیبل کے نفوذ میں ردّ و بدل ——— یہ حقیقت ہے کہ ٹائم ٹیبل کی پہلی تشکیل طلباء پر بڑی گراں تھی ——— اس کی وجہ؟ بی۔ اے کے طلباء کی مثال لیجیے۔ انہیں کُل پانچ پیریڈ attend کرنا ہوتے ہیں لیکن یہ پانچ پیریڈ attend کرنے کے لئے انہیں بقیہ چار درمیانی پیریڈ بھی کالج میں گزارنے ہوتے تھے۔ اور یہ "تین گھنٹے" بھی کچھ اس طرح ہوتے تھے کہ ایک پیریڈ لگ رہا ہے اور اس سے اگلا خالی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ طلباء اپنے ان خالی اوقات سے فائدہ اُٹھا سکیں ——— بہرحال اب جبکہ پیریڈ چالیس منٹ کے ہو گئے ہیں اور Recess ٹائم اُڑا دیا گیا ہے اس سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ ڈیڑھ بجے تک طلباء فارغ ہو جاتے ہیں اور باقی وقت دلجمعی سے پڑھائی میں صرف کر سکتے ہیں۔ ہم جناب پرنسپل صاحب سے مؤدبانہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ اسی ٹائم ٹیبل کو رمضان المبارک کے بعد بھی جاری رکھ کر طلباء پر احسان فرمائیں۔

کالج یونین اور وقت کی پابندی

سب کو معلوم ہے کہ سادگی اور وقار ہمارے کالج کی روایات میں سے ہیں۔ یونین کے اجلاس میں بھی اکثر ان روایات کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ آج ہمیں کچھ وقار کے متعلق عرض کرنا ہے۔

ہمارے خیالِ ناقص میں وقار ہرگز صرف اس بات کا نام نہیں کہ صاحبِ صدر ہال کے پچھلے دروازے ہی سے حاضرین کے درمیان سے گزرتے ہوئے کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہو کر تلاوتِ قرآنِ پاک کا حکم دیں بلکہ وعدہ کا پورا کرنا بھی وقار کے لوازم میں سے ہے۔ جب یونین کے سیکرٹری صاحب ساڑھے چھ بجے جلسہ کا وقت دیتے ہیں اور جلسہ سوا سات بجے شروع ہوتا ہے تو گویا یونین خود ہی وقار کے خلاف حرکت کر رہی ہوتی ہے۔

ہم نہ صرف کالج یونین بلکہ دوسری سوسائٹیوں کی یہ روایت دیکھ چکے ہیں کہ وہ اپنے دیے ہوئے وقت کی کبھی پابندی نہیں کرتیں۔ متعلقہ حضرات سے التماس ہے کہ وہ وقت اور پابندیٔ وقت کو جُدا جُدا نہ سمجھیں!

داخلے

اگر مین سافکورس کا اجرا نہ ہوگیا ہوتا تو بیقین اغلب ہے کہ بی۔ اے کے کافی طلباء کمند ٹوٹ جانے پر لب بام سے ہمکنار ہونے سے رہ جاتے لیکن جناب پرنسپل صاحب کی نگاہ دوررس نے اُن طلباء کے داخلہ رک لئے جانے کے عواقب کا اندازہ لگاتے ہوئے انہیں قسمت آزمائی کا موقعہ دے ہی دیا۔ اس طرح تمام طلباء کے لئے یہ ممکن ہوجائے گا کہ اگر خدانخواستہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو کم از کم اس کے بعد وہ یونیورسٹی کے دیئے ہوئے موقع سے (اگر کوئی دیا گیا) فائدہ تو اٹھا سکیں گے۔ داخلہ رک جانے کی صورت میں اس کے سوا اور کوئی صورت نہ رہ جاتی کہ وہ تین سالہ کورس میں بی۔ اے پاس کریں۔ ممکن ہے کہ ان طلباء نے چند دن تک جناب پرنسپل صاحب کی اجازت کے انتظار میں جو ذہنی دھچکہ کھایا ہے وہ انہیں دوسرے طلباء پر سبقت لے جانے کے جذبہ سے ہمکنار کر دے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ یقیناً تعریف کے مستحق ہوں گے۔

خُذُوا التَّوحِیدَ التَّوحِیدَ یَا اَبنَاءَ الفَارِسِ

(بقیہ صـ۱)

ہمیں رضاء محبت کی راہوں کی طرف ہدایت فرمائے وہی ہمارا حقیقی معبود و مقصود و محبوب ہو جائے۔ کاش یہ حقیقت ہمارے دلوں کی گہرائیوں تک سرایت کرجائے اور ایمان کی حلاوت ہمیں نصیب ہو۔ تا زندگی کی کسی مبارک ساعت میں اُس حقیقی محبوب و معبود کی یہ شیریں آواز ہمارے قلوب پر بھی نازل ہو کہ:۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ
ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً
مَّرْضِيَّةً۔ فَادْخُلِي فِي
عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝

حرف

۱۔ "محبت کی آگ سے زیادہ کوئی آگ نہیں جس دل میں محبت ہے اُس میں جو کچھ آئیگا جل جائے گا۔"

(حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ)

۲۔ "محبت حال ہے۔ حال کبھی قال نہیں ہوتا یعنی اگر کوئی زبردستی محبت کرنا چاہے تو یہ ناممکن ہے۔"

(حضرت داتا گنج بخشؒ)

۳۔ "زاہد بے علم تسخیر شیطان میں آجاتا ہے۔" (حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ)

پروفیسر بشارت الرحمٰن

ایم-اے

توحیدِ کامل

خُذُوا التَّوْحِیْدَ یَا اَبْنَاءَ الْفَارِسِ

(الہام حضرت مسیح موعود علیہ السلام)

ان چند سطور میں جن کا تحریر میں لانا اس وقت پیش نظر ہے خاکسار اپنے سکول کے زمانے کی ایک یاد تازہ کرنی چاہتا ہے۔

تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان میں خاکسار ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ سکول میں ایک مشاعرہ ہوا طرح مصرع تھا ؎

قادر کے کاروبار نمودار ہو گئے

میرے ایک ہم جماعت نے بھی ایک نظم لکھی۔ اس نظم میں ایک شعر میں یہ الفاظ تھے، سارا شعر یاد نہیں ؎

"..... محمود کے پرستار ہو گئے"

یہ نظم سکول کے رسالہ "تعلیم الاسلام ہائی سکول میگزین" میں شائع ہوئی۔ اور ہمارے امام ہمام حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی نظر سے بھی گزری۔ حضور کو مندرجہ بالا الفاظ پر اعتراض پیدا ہوا اور حضور نے جواب طلبی فرمائی۔ میرے محترم استاد ماسٹر نذیر احمد صاحب رحمانی مرحوم و مغفور (اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے) نے یہ جواب دیا (آپ رسالہ کے اردو سیکشن کے انچارج تھے) کہ لغت میں "پرستار" کے لفظ کے معنی "مداح" کے بھی ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ شعر قابل اعتراض نہیں رہتا لیکن حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے اس عذر کو قبول نہ کیا اور ایک مضمون رقم فرمایا جو ہمارے "سکول میگزین" کی اگلی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس مضمون کا عنوان یہی تھا۔ خُذُوا التَّوْحِیْدَ التَّوْحِیْدَ یَا اَبْنَاءَ الْفَارِسِ! حضور کے مضمون کا خلاصہ یہ تھا کہ حضور نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے الہام مندرجہ بالا میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو مخاطب

فرماتا ہے اور پھر آپ کے ساتھ آپ کی ساری روحانی و جسمانی ذریت کو مخاطب فرماتا ہے کہ اے فارس کے بیٹو! توحید کو پکڑو۔ توحید کو پکڑو۔

بے شک، تمام سچے احمدی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی روحانی ذریت ہونے کی وجہ سے ابنائے فارس ہیں۔ کیونکہ ان کا آقا آں حضرت سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کے مطابق رَجُلٌ مِّنْ فَارِسٍ ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر ایمان (اور ایک روایت کے بموجب قرآن) زمین سے اٹھ کر ثریا پر بھی پہنچ جائے گا تو ایک فارسی الاصل مرد (رَجُلٌ مِّنْ اَبْنَاءِ الْفَارِسِ) اُسے وہاں سے بھی واپس لے آئے گا۔

پس الہام مندرجہ بالا میں ہر سچے احمدی کو اللہ تعالےٰ نے توحید پر قائم ہونے اور ہر حالت میں قائم رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالےٰ نے اپنے اُس مضمون میں رقم فرمایا کہ خواہ لغت میں پرستار کے اور معنی کیوں نہ ہوں۔ پھر بھی احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ مومن ایسے الفاظ کو جو اپنے عام مفہوم کے لحاظ سے اللہ تعالےٰ سے مختص ہیں، دوسروں کے لئے استعمال نہ کرے۔ توحید باری تعالےٰ دراصل سچے مذہب کی جان ہے۔ یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد تمام سچے ادیان کی تعلیمیں چکر لگاتی ہیں۔ اس کو قائم کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء مبعوث فرمائے۔ پس ایسے غیر محتاط الفاظ (خواہ لغت کے اور معانی بھی کیوں نہ ہوں) استعمال نہیں کرنے چاہئیں جن سے توحید باری کے سلسلے میں اشتباہ پیدا ہوتا ہو۔

خاکسار نے "المنار" کی زیر نظر اشاعت میں حضور کے اُس مضمون کا خلاصہ بیان کر کے اپنی ایک پرانی یاد تازہ کی ہے۔ تقریب اُس کی یہ پیدا ہوئی کہ "المنار" کی گزشتہ اشاعت میں عزیزم محمد ہادی صاحب مونس کی ایک نظم شائع ہوئی ہے جس کا ایک شعر تعلیم الاسلام کالج کے متعلق یہ ہے ؎

چٹانوں کے دامن کی اُجلی فضا میں مری ٹی آئی کالج کی رنگیں عمارت
حقیقی تعلّم کی وہ درسگاہ ہے بصد شوق کی جس کی میں نے عبادت

اس شعر میں "عبادت" کا لفظ بھی درست طور پر استعمال نہیں ہوا۔ یہ بالکل اسی قسم کی غلطی ہے جیسی کہ میرے ایک ہم جماعت سے ہوئی تھی جس کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے۔

عبادت اللہ تعالیٰ سے ہی مختص ہے خواہ اس لفظ کے اور معنی بھی کیوں نہ ہوں۔ پھر بھی احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ہم غیر اللہ کے لئے اسے استعمال نہ کریں۔ ہمارے آقا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنے صحابہ کو اس بات سے بھی منع فرما دیا کہ اپنے کسی غلام یا لونڈی کو "یَا عَبْدِیْ" اور "یَا اَمَتِیْ" کے الفاظ سے پکاریں۔ تا توحید باری میں کسی قسم کا اشتباہ پیدا نہ ہو۔

میں امید کرتا ہوں کہ عزیزم محمد ہادی صاحب مونس اپنی اس غلطی کو اچھی طرح نوٹ فرمالیں گے۔ اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو خالص توحید پر قائم کر دے اور

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

عطاء المجیب راشد
سالِ دوم

پروازِ تخیل

کردار:۔

عابد	اکنامکس کا طالب علم
زاہد	دینیات کا طالب علم
طاہر	تاریخ کا طالب علم
حامد	فلاسفی کا طالب علم
شاہد	میڈیکل کا طالب علم
خالد	سیاحتی کا طالب علم

نوٹ: (نام اور کردار سب فرضی ہیں کسی سے مطابقت محض اتفاقی ہو سکتی ہے:)

کالج حسبِ معمول کھلا ہے۔ اکثر طلباء اپنی کلاسوں میں ہیں لیکن پھر بھی طلباء کی ایک بڑی تعداد اِدھر اُدھر چکر لگا رہی ہے۔ ان "گشتی طلباء" کا "اڈہ" عام طور پر نوٹس بورڈ کے قریب ہی ہوتا ہے۔

آئیے آپ کو نوٹس بورڈ تک لے چلیں۔ جہاں پر اس وقت بھی چند طلباء محوِ گفتگو نظر آتے ہیں۔ تھوڑا قریب ہونے سے آواز دھیمی سنائی دیتی ہے۔ بالکل نزدیک آنے پر آواز بالکل صاف سنائی دے رہی ہے معلوم ہوتا ہے کہ گفتگو کچھ کالج کے یونیفارم کے بارہ میں ہو رہی ہے۔

ہاں تو سنیئے! گفتگو یوں چلتی ہے:۔

عابد (اکنامکس کا طالب علم) بالکل درست! یہ بات تو سولہ آنے سچ ہے کہ ہر کالج کا کوئی نہ کوئی یونیفارم ہونا چاہیئے۔

زاہد (دینیات کا طالب علم) لیکن ایک بات میں ضرور کہوں گا کہ اس کو مقرر کرنے کے بارہ میں کم از کم کالجوں کے پرنسپل صاحبان کو مکمل آزادی ہونی چاہیئے۔ تاکہ وہ طلباء کے ماحول، حالات اور مالی حالات کے اندازہ سے کوئی یونیفارم

مقرر کر سکیں۔ دین کہ جس پر انسان کی جزا سزا کا انحصار ہے۔ اُس کے بارہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کہ دین کے بارہ میں کوئی جبر نہیں۔ تو پھر اس معمولی سے معاملہ میں تو ضرور آزادی ہونی چاہیئے۔

طاہر (تاریخ کا طالب علم) خدا معلوم آپ کی یہ بات اربابِ اختیار کے کانوں تک پہنچی ہے یا نہیں۔ بہرحال انہوں نے ہر پرنسپل کو اپنی مرضی پر چھوڑا ہے اور اسی لئے تو ہمارے کالج کی یونیفارم سب کالجوں سے انوکھی اور نرالی ہے۔

حامد (فلاسفی کا طالب علم) لیکن آپ کو اس یونیفارم پر تعجب کیوں ہے؟ میرے خیال میں تو تعجب کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ آپ کے ذہن میں وہ بات ہو جو میرے ذہن میں نہیں اور میرے ذہن میں وہ بات ہو جو آپ کے ذہن میں نہیں۔ اگر ایسا ہی معاملہ ہے تو کوئی "کافی جواز" پیش کیجئے۔

طاہر:۔ اب آپ کو وجہ کیا بتائی جائے۔ اور نہ ہی میں کوئی عدالتی بیان جاری کرنے والا ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ یہ یونیفارم ہے ہی کچھ عجیب سا۔!

حامد:۔ لیکن جب تک "کافی جواز" نہ ہوگا۔ مَیں تو آپ کی اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

زاہد:۔ خیر جناب چھوڑیئے اس بات کو۔ سوال یہ ہے کہ یہ گاؤن اتنا مہنگا کیوں بِک رہا ہے۔ شروع میں تو خیال تھا کہ دس یا بارہ روپوں میں ہی کام بن جائے گا لیکن اب تو دن رات روزافزوں ترقی ہو رہی ہے۔ اللہ ہی خیر کرے۔

عابد:۔ میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ مجھ سے تعلق رکھتا ہے۔ مَیں ہی جواب دوں تو بہتر رہے گا۔

سب:۔ ہاں ہاں فرمایئے۔ دراصل یہ مسئلہ آپ ہی کا ہے۔

عابد:۔ (عینک کو درست کرتے ہوئے) بات یہ ہے کہ پہلے کپڑا سستا تھا یعنی رسد زیادہ تھی اور طلب کم تھی۔ اکنامکس کا اصول ہے کہ جب رسد زیادہ ہو اور طلب کم ہو تو قیمتوں میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے کپڑا سستا تھا۔ لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ اب رسد کم ہے اور اس کے مقابلے پر طلب بہت زیادہ ہے اس وجہ سے قیمتوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ تو اکنامکس کا عام قاعدہ ہے۔ اس میں کسی ایک فرد کا قصور نہیں اور نہ ہی کالج والوں کی زیادتی ہے۔

حامد:۔ دیکھئے عابد صاحب نے بات کی ہے تو کوئی "کافی جواز" پیش کیا ہے نا! اب ہر کوئی ان کی بات ماننے پر مجبور ہوگا۔ خاص طور پر "ہم" تو "کافی جواز" کے بغیر کوئی بات مان ہی نہیں سکتے۔

زاھد:- میرا خیال ہے کہ اتنی زیادہ رقم صرف کر کے ایک گاؤن خریدنا تو فضول خرچی میں داخل ہوگا اور فضول خرچی وہ کام ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ قرآن پاک میں آتا ہے لَا تُسْرِفُوْا یعنی فضول خرچی نہ کرو۔ ڈر یہی لگتا رہتا ہے کہ کہیں یہ یونیفارم خریدتے خریدتے اسراف کے مرتکب نہ بن جائیں۔

حامد:- خیر آپ اس بات کی فکر نہ کریں۔ اگر ہم اسراف کے مرتکب ہو بھی گئے تو اس کی ذمہ داری کالج والوں پر عاید ہوگی جو ہم کو یہ خریدنے پر "مجبور" کرتے ہیں۔

طاھر:- لڑکوں کو گاؤن پہننے کا شوق تو بہت ہے ممکن ہے کہ تنگی زندگی سے ہر کوئی خرید ہی لیگا۔ سوال تو ٹوپی کا ہے جس کا سر پہ لانا اکثر طلباء کو گوارہ ہی نہیں۔

(اس دوران میں ڈاکٹری کا ایک طالب علم ہاتھ میں ٹوپی پکڑے آتا ہے اور سب سے مصافحہ کر کے اُن کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے)

شاھد:- فرمائیے کیا بات چل رہی تھی؟

زاھد:- ذرا ٹوپیوں کے متعلق بات ہو رہی تھی۔ آپ کا کیا خیال ہے ان کے بارہ میں؟

شاھد:- خیال نیک ہی ہے۔ جہاں تک ٹوپی کی ذات کا سوال ہے میں اسے بہت مفید سمجھتا ہوں لیکن پھر بھی اس کا سر پہ پہننا مجھے مشکل سا کام نظر آتا ہے۔

عابد:- سمجھ نہیں آتی کہ آپ ٹوپی کو مفید بھی کہتے ہیں لیکن اس کو سر پہ پہننے پر بھی راضی نہیں اور اس سے ہمیشہ ہی احتراز کرتے ہیں۔ دیکھئے اب بھی آپ کی ٹوپی آپ کے ہاتھ میں ہی ہے۔

شاھد:- دراصل بات یہ ہے عابد صاحب! کہ سر پہ ٹوپی پہننے سے کچھ دماغی تکلیف سی محسوس ہوتی ہے، دماغ گھٹا گھٹا سا محسوس ہوتا ہے اور خاص طور پر جب کہ سخت گرمی کا موسم ہو ٹوپی پہننے سے سر پہ کیمیائی عمل بھی شروع ہو جاتا ہے۔ جب تیل، دباؤ اور گھٹاؤ ملتے ہیں اور گرمی اُن پہ بطور عامل کام کرتی ہے تو سر درد، کند ذہنی، تکلیف، بخارات اور "برین آکسائڈ" جیسی نہ جانے کتنی چیزیں جنم لیتی ہیں اور دماغ چکرانے لگتا ہے۔

حامد:- اور اس کے ساتھ ساتھ دماغ میں "گھٹن" بھی پیدا ہونے لگتی ہے اور یہی ہے کہ عقل بھی دماغ سے مفارقت دے جاتی ہے۔

طاھر:- حامد صاحب! ابھی آپ ہر ایک بات کا "کافی جواز" کا مطالبہ کر رہے تھے۔ کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ آپ کے پاس اس بات کا کونسا "کافی جواز" ہے؟ آخر آپ نے بات کی ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کی ہو گی۔ آپ ہوئے جو فلاسفر!

حامد:- (دو چار منٹ سوچ کر) بھئی اس میں "کافی جواز" کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو عام مشاہدہ ہے کہ جو لڑکا بھی باقاعدگی سے ٹوپی کو سر سے چپکائے رکھتا ہے اور عام طور پہ علیحدہ کرنے کی زحمت گوارا ہی نہیں کرتا وہ چند ہی دنوں بعد "بقلم خود" سا معلوم ہوتا ہے۔

طاہر:- دیکھئے جناب! فلاسفی کے طالب علم ہوتے ہوئے آپ کو یہ سب "[illegible]" اور "کافی ہاؤز" کے تجربات، کچھ زیب نہیں دیتی۔ مزا تو تب تھا کہ۔۔۔۔

زاہد:- (بات کاٹتے ہوئے) بہت اچھے طاہر صاحب! آپ نے تو ہمارے صاحب کو خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے۔

طاہر:- اگرچہ میں فلاسفی کا طالب علم نہیں ہوں لیکن پھر بھی میرے پاس اپنے حق میں کافی سے زیادہ مواد ہے۔

شاہد:- فرمائیے فرمائیے!

طاہر:- (اپنے خاص انداز میں) دیکھئے! اگر ہم تاریخ کے اوراق کا ایک سرسری سا بھی جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ تمام بڑے بڑے بادشاہ جنہوں نے اس دنیا میں ناموری حاصل کی ہے اور سالہا سال تک اپنے ملک پر کامیابی سے حکومت کرتے رہے وہ ہمیشہ تاج پہنا کرتے تھے۔

خالد (حساب کا طالب علم) سنائیے جناب!
(درمیان میں آتے ہوئے) کیا بات ہے؟ محفل بڑی گرما گرم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گرمی کا یہاں پر بھی اثر ہے۔

حامد:- (قدرے اکتاتے ہوئے) ہونا کیا ہے۔ بس میری ہی باتوں پہ جرح ہو رہی ہے۔

طاہر:- ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ نامور بادشاہ بھی تاج پہنا کرتے تھے اور تاج بلحاظ بوجھ، دباؤ، تنگی اور گرمی کے کسی طرح بھی ٹوپی سے مختلف نہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ جہانگیر نے اپنے عہد میں کئی ایک اعلیٰ تاج بنوائے تھے۔ اور اکبر اعظم کا تاج بے مثل سمجھا جاتا ہے۔ نہ معلوم ان تاجوں نے اُن کی عقلوں کو سلب کیوں نہ کیا اور اُن کے دماغوں کو ماؤف کیوں نہ کیا۔ بلکہ وہ تو اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب حاصل کرتے گئے اور اُن کا قدم ہمیشہ ترقی کی جانب بڑھتا گیا۔

خالد:- (تقریباً بے تاب ہو کر) بس ثابت ہوا کہ ٹوپی دماغی توازن میں خلل انداز نہیں ہوتی۔

عابد:- (ہنستے ہوئے) سچ ہے جس کام کی دن رات عادت ہو وہ چھٹ نہیں سکتا کسی نے کہا ہے کہ سہ

ہو جاتی ہے جب راسخ وہ علت چھٹ نہیں سکتی

خالد:- جی ہاں درست فرمایا ہے کہ جس کام کی عادت ہو آدمی وہ کام کئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہاں پر بس ہی نہیں۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے ذوق کی بات کر رہا ہے۔

طاہر:- لیکن ہمیں سوچنا ہے کہ آخر ہمارے کالج کے طلباء ٹوپی کو سر پر پہننے سے عار کیوں سمجھتے ہیں؟

شاہد:- میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے طلباء ٹوپی کو پسند نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے وہ اسے پہنتے نہیں۔

زاہد:- لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جس چیز کو ہم پسند کرتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ ہمارے حق میں مفید ہو اور جس چیز کو ہم ناپسند کرتے ہیں ممکن ہے کہ وہ ہمارے حق میں بہتر ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن پاک میں اسی مضمون

کی آیات نازل فرمائی ہیں۔ جس نالپسندیدگی
کو ٹوپی نہ پہننے کی وجہ بتانا ہمارے لئے
یقینی طور پر مفید نہیں ہو سکتی۔ اور عابد صاحب
کے نزدیک یہ "کافی جواز" بھی نہ ہوگا۔

حامد:۔ میں بھی اب کچھ کہہ دوں تو کچھ حرج نہ ہوگا۔
کافی دیر آپ نے چپ کرائے رکھا . . . .
. . . . اب کالج کے لڑکوں کے دلوں
میں ٹوپی کی صحیح عظمت اور عزت ہی نہیں ہے۔
یعنی جب اُن کو کہا جاتا ہے کہ ٹوپی کو زیب
سر کیجئے تو اُن کے دل میں ٹوپی کی عظمت کا خیال
تک بھی نہیں گزرتا بلکہ سمجھا جاتا ہے کہ ہمیں
یونیفارم کی پابندی ضروری کرنی ہے۔

عابد:۔ ہاں یہ بات تو ضرور ہر ایک کے دل سے
گزرتی ہے۔

حامد:۔ لیکن ہماری فلاسفی کی رُو سے ایک چیز
ایک وقت میں ایک ہی معنی کے لئے استعمال
ہو سکتی ہے۔ ایک سے زیادہ کے لئے نہیں۔
یعنی جب ٹوپی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو یا تو
اس کی عظمت کا خیال دل میں آ سکتا ہے یا پھر
یونیفارم کی پابندی کا خیال۔ لیکن دونوں اکٹھے
نہیں آ سکتے۔ اور جب تک یہ بات نہ ہو ٹوپی کی
عزت قائم نہیں ہو سکتی۔ اور چونکہ یہ بات
قرین قیاس نہیں اس لئے ٹوپی کو شوق سے
پہننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

زاہد:۔ حامد صاحب کی یہ بات کچھ درست معلوم
ہوتی ہے۔ جو بات درست ہو اُس کو کہنے سے
میں جھجکتا نہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بھی
اسی کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ قُولُوا
قَوْلًا سَدِيدًا۔ اسی لئے میں سچ
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جیسے حق

عابد:۔ موجودہ "رائج شدہ" ٹوپی کی قیمت
غالباً تین روپے ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ
یہ ضرورت سے زیادہ ہے۔ اگر ہم اکنامکس
کے اصولوں پر عمل کریں تو اس طرح کافی بچت
کر سکتے ہیں۔ یعنی اگر اس ٹوپی کو بجائے کپڑے
کی ٹوپی رائج کر دی جائے تو اس طرح کافی سے
زیادہ بچت ہو سکے گی اور یہی بات اکنامکس
کا بنیادی اصول ہے ۔۔۔۔۔۔

خالد:۔ ٹھیک ہے۔ اس طرح ہم کافی روپیہ بچا سکتے
ہیں۔ مطلب ہے کہ اگر کپڑے کی ٹوپی آٹھ آنے
کی ہے تو گویا دو روپے آٹھ آنے فی طالب علم
کے حساب سے بچت ہوگی۔ ہمارے کالج کے
تقریباً چھ سو طالب علم ہیں۔ اس طرح
۶۰۰ × ۲½ = کل ۱۵۰۰ روپے کی بچت
ہوگی جو کسی اور کام میں صرف کی جا سکتی ہے۔

طاہر:۔ ویسے یہ بات ہے کہ جو لڑکے ٹوپی کو ہاتھ
میں پکڑے رکھتے ہیں اور سر پر نہیں پہنتے وہ
کئی فائدے بھی اٹھاتے ہیں۔ مثلاً ——
کتابیں ٹوپی کے اندر رکھ کر پکڑتے ہیں۔ ٹوپی
کو مسند کے طور پر بھی استعمال کرتے
ہیں۔ ٹوپی پنکھا جھاڑن کا "نعم البدل" متصور
ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ویسے یہ کوئی نئی اور
عجیب بات نہیں۔ تاریخ پڑھنے سے پتہ چلتا ہے
کہ دنیا کے لوگ ہمیشہ ہی بعض چیزوں سے

ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

زاہد:۔ لیکن طاہر صاحب! اُن کو "بعض مصائب" کا سامنا بھی تو کرنا پڑتا ہے نا! ۔ اگر کوئی "محتسب" اچانک آ نکلے تو پھر اُن کو ٹوپی پہننی ہی پڑتی ہے اور ٹوپی پہ سے "اُترنا" ہی پڑتا ہے۔ لیکن ٹوپی پہنتے ہوئے اُن کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ جب انہیں بادلِ ناخواستہ اپنے دل پر پتھر رکھ کر کئی گھنٹوں کی "محنتِ شاقہ" کے بعد تیار کردہ "گیسوؤں" کو ٹوپی کی آڑ میں چھپانا ہی پڑتا ہے۔ وہ بالوں کو چھپاتے ہیں لیکن ٹوپی کو صحیح معنی میں پہننے سے پھر بھی کتراتے ہیں۔

(اتنے میں گھنٹی بجتی ہے اور طلباء اپنی کلاسوں کو چل دیتے ہیں۔ کالج حسبِ معمول کھلا ہے۔ اکثر طلباء اپنی کلاسوں میں ہیں لیکن پھر بھی طلباء کی ایک بڑی تعداد اِدھر اُدھر چکر لگا رہی ہے.....)

◆

"ہر مصیبت انسان کو زیادہ مضبوط کرنے کا باعث ہوتی ہے!"

(دیوان سنگھ مفتون)

نعیم قدسی

غزل

ظلم کو بھی ادا کیا تُو نے
جو کیا سو بھلا کیا تُو نے

نامہ بر کیوں پیام لایا ہے
کوئی دشنام بھر دیا تُو نے؟

صبح گلشن میں پھول کھلتے تھے
خوب! روندا انہیں صبا تُو نے!

ساغر و مینا و سبو ٹوٹے
شیخ! کیا دی ہے بد دعا تُو نے؟

تیری آنکھوں سے مے برستی ہے
مجھ کو میخوار کر دیا تُو نے

دل کی بستی میں آنے والے پھر
دشت، گلزار کر دیا تُو نے

پروفیسر محمد الدین ایم۔ اے

عُمر خیام کی چند رُباعیات

نزاکتِ خیال، ندرتِ بیان، اختصار اور تاثیر کلامِ عمر خیام کی رباعیات کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان خصوصیات نے عمر خیام کو تمام دنیا میں مقبولِ عوام بنا دیا ہے۔ اُمید ہے کہ اس ہر دلعزیز شاعر کی مندرجہ ذیل رباعیات صاحبانِ ذوق پسند فرمائیں گے۔

(۱)

خدا تعالیٰ کی کُنہ کو کوئی نہیں پا سکتا۔ خیام خدا تعالےٰ کو بھی طلب کرتے ہوئے اس خیال کو اِس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

کُنہِ خردم در خورِ اثباتِ تو نیست
و اندیشۂ من بجز مناجاتِ تو نیست
من ذاتِ ترا بواجبی کَے دانم
دانندۂ ذاتِ تو بجز ذاتِ تو نیست

حقیقت یہ ہے کہ اے خدا میری عقل تیری ذات کو ثابت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اور مَیں صرف تیری تعریف اور مناجات کے متعلق ہی سوچ سکتا ہوں۔ اے خدا میں تیری ذات کو صحیح طور پر کیسے جان سکتا ہوں۔ تیری ذات کی حقیقت کو صرف تیری ذات ہی سمجھ سکتی ہے

(۲)

خدا تعالےٰ کے احسانات عمیمہ اور اس کی تقدیس کو اِس رباعی میں کس خوبی سے بیان کیا گیا ہے ؎

در دیدۂ تنگِ مور نور است از تو
در پائے ضعیفِ پشہ زور است از تو
ذاتِ تو سزا است مر خداوندی را
ہر وصف کہ نا سزا است دور است از تو

اے خدا چیونٹی کی چھوٹی سی آنکھ میں تیرا ہی عطا کردہ نور ہے۔ اور مچھر کے کمزور پاؤں میں تیری ہی دی ہوئی طاقت ہے۔ اے خدا تیری ذات ہی خداوندی کے لائق ہے۔ ہر ایک بُری صفت سے تو پاک ہے۔

(۳)

اپنے عشق اور دلباختگی کو کس عجیب انداز میں بیان کرتے ہیں ؎

از بادِ صبا دلم چو بوئے تو گرفت
ما را بگذاشت جستجوئے تو گرفت
اکنوں ز منش ہیچ نمی آید یاد
بوئے تو گرفتہ بود خوئے تو گرفت

جب میرے دل نے بادِ صبا میں تیری خوشبو کو محسوس کیا تو وہ مجھے چھوڑ کر تیری جستجو میں نکل گیا۔ اب وہ مجھے بالکل یاد نہیں کرتا۔ اس نے تیری خوشبو پانے کے بعد تیری عادت کو بھی اختیار کر لیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عاشق کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔ اور اس کا دل اس طرف سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔

(۴)

خیام ریاضی دان ہے۔ اس رنگ میں بھی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں ؎

جانا من و تو نمونۂ پرکاریم
سر گرچہ دو کردہ ایم یک تن داریم
بر نقطہ روانیم کنون دائرہ وار
تا آخر کار سر بہم باز آریم

پیارے میں اور تُو پرکار کی طرح ہیں۔ اگرچہ ہمارے دو سر ہیں۔ مگر جسم ایک ہی ہے۔ ہم دائرہ کی طرح نقطہ پر چل رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کار ہمارے سر مل جائیں گے یعنی بالکل ایک ہو جائیں گے۔

(۵)

عام طریقہ یہی ہے کہ اگر کسی سے گناہ سرزد ہو تو وہ خدا تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہے لیکن خیام ہمیں اس سے ایک قدم آگے لے جاتا ہے۔ اور ہمارے پہلے نقطۂ نظر کو بدل دیتا اور ایک گہرے فکر میں ڈال دیتا ہے ؎

با نفس ہمیشہ در نبردم چہ کنم
وز کردۂ خویشتن بدردم چہ کنم
گیرم کہ ز من درگذرانی بکرم
زیں شرم کہ دیدی کہ چہ کردم چہ کنم

میں ہمیشہ اپنے نفس سے جنگ کرتا رہتا ہوں۔ اور اپنے بُرے اعمال سے تکلیف پاتا ہوں۔ اے خدا! میں نے مان لیا کہ تُو اپنے کرم سے درگزر کریگا۔ لیکن میں اس شرم کا کیا علاج کروں کو بُرے کام کرتے ہوئے تُو نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ (خدا تعالیٰ کے متعلق ایسا یقین ہی درحقیقت گناہوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔)

(۶)

اسی خیال کو ایک اور رنگ میں ظاہر کرتا ہے ؎

تا ظن نبری کہ از جہاں می ترسم
وز مُردن و از زادن جاں می ترسم
مُردن چو حقیقت است زاں باکم نیست
چوں نیک نزیستم ازاں می ترسم

آپ یہ گمان نہ فرمائیں کہ میں دنیا سے ڈرتا ہوں۔ اور جان دینے سے گریز کرتا ہوں۔ چونکہ مرنا یقینی امر ہے اسلئے میں اس سے نہیں ڈرتا۔ میں تو صرف اس بات سے ڈرتا ہوں کہ میں نے زندگی صحیح طور پر بسر نہ کی (اسلئے آپ کے پاس آتے ہوئے شرم آتی ہے)۔

(۷)

زاہد کی خدا تعالیٰ سے بیگانگی ہمیشہ موضوع بحث رہی ہے۔ خیام نے اس رباعی میں زاہد کی بیگانگی کے بیان سے اپنی بخشش کے حصول کے لئے راستہ ہموار کیا ہے۔ کیا مؤثر انداز ہے ؎

زاہد بکرم ترا چو ما نشناسد
بیگانہ ترا چو آشنا نشناسد
گفتی کہ گناہ کنی بدوزخ برمت
ایں را بکسے گو کہ ترا نشناسد

اے خدا! زاہد تیرے کرم کو اس طرح نہیں پہچانتا جس طرح ہم پہچانتے ہیں۔ کیونکہ بیگانہ تجھ کو آشنا کی طرح نہیں پہچان سکتا۔ اے خدا! تو نے کہا کہ "چونکہ تو گناہ کرتا ہے اس لئے تجھے دوزخ میں لے جاؤں گا"۔ یہ بات کسی ایسے شخص کے آگے بیان کر جو تجھے نہیں پہچانتا۔ (خدا تعالیٰ کے کرم اور بخشش کی نہایت اعلیٰ تعریف بیان کی گئی ہے)۔

(۸)

اسی طرح زاہد کے مقابل پر مغفرت طلبی کا ایک نادر طریقہ اختیار کیا ہے جو نہایت موثر ہے ؎

زاہد نہ کند گنہ کہ قہاری تو
ما غرقِ گناہیم کہ غفاری تو
او قہارت خواند و من غفارت
آیا بکدام نام خوش داری تو

زاہد گناہ نہیں کرتا کیونکہ وہ تجھے قہار سمجھتا ہے۔ ہم گناہ میں غرق ہیں کیونکہ تو غفار ہے۔ وہ تجھے قہار کہتا ہے اور میں تجھے غفار کا نام دیتا ہوں۔ تجھے ان میں سے کونسا نام پسند ہے ؟

(۹)

اسی طرح ایک اور نادر انداز میں خدا تعالےٰ سے مغفرت طلب کرتے ہیں ؎

درپائے غمت شد دلِ مسکینم پست
یارب چہ شود اگر بگیری دست
گر در عملم آنچہ ترا باید نیست
اندر کرمت آنچہ مرا باید ہست

تیرے غم کے نیچے میرے مسکین دل کی حالت نہایت خراب ہے۔ اے خدا اگر تو میرا ہاتھ پکڑ لے تو اس میں تیرا کیا نقصان ہے۔ اگر میرے اعمال میں وہ چیز موجود نہیں جو تجھے درکار ہے۔ تو کیا حرج ہے۔ کیونکہ تیرے کرم میں وہ چیز موجود ہے جو مجھے درکار ہے۔

(۱۰)

آخر میں ایک اور رباعی ملاحظہ فرمائیں۔ سب کو معلوم ہے کہ جب کسی چیز میں نقص پایا جائے تو اس کا الزام اس کے کاریگر پر آتا ہے۔ اس امر کو کس خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ ذرا شوخی ملاحظہ ہو ؎

سازندۂ کارِ مردہ و زندہ توئی
دارندۂ ایں چرخ پراگندہ توئی
من گرچہ بدم خواجۂ آں بندہ توئی
کس را چہ گنہ کہ آفرینندہ توئی

اے خدا تو ہی ہر ایک ممکن اور ناممکن کام کو بنانے والا ہے۔ اس پراگندہ آسمان کو تو ہی قائم رکھنے والا ہے۔ میں اگرچہ بُرا ہوں مگر تو ہی اس غلام کا آقا ہے۔ کسی کا کیا گناہ جبکہ پیدا کرنے والا تو ہی ہے۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ جملہ "میرا کیا گناہ ہے" کی بجائے "کسی کا کیا گناہ ہے" استعمال کیا گیا ہے۔ جو اس شوخی کو دوبالا کر رہا ہے ؂

* * *

"سچے دوست کا ملنا مشکل ہے۔ تاہم ایک ایسا شخص ہونا چاہیے جو جذبات کو سمجھتا ہے۔"

(بیکن)

"سیرت کے بغیر صورت خوشبو سے محروم اور کانٹوں سے بھرے پھول کی طرح ہے۔"

(ارسطاطالیس)

"جب انسان شیر کو مارنے جاتا ہے تو اسے شکار کھیلنا کہتے ہیں لیکن جب شیر انسان کو مارتا ہے تو اسے درندگی کہا جاتا ہے۔ جرم اور انصاف میں صرف اتنا ہی فرق ہے۔"

(برنارڈ شا)

لطف الرحمٰن محمود

تأثرات

ایک زائر کی آپ بیتی

"داخلے"

یادش بخیر! اس داخلے سے کسی ہال یا کمرے میں داخلہ مراد نہیں بلکہ بورڈ یا یونیورسٹی کے امتحانات میں بیٹھنے والا داخلہ مقصود ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ سال کے کئی موسم ہوتے ہیں۔ یہی حال درسگاہوں کے تعلیمی سال کا ہے۔ مثلاً فرسٹ ایئر کے داخلے کا موسم ہے۔ یہ داخلہ اول الذکر داخلے کی طرح تو خطرناک نہیں۔ بلکہ اس کا موسم تو گویا موسم بہار ہوتا ہے۔ مدارس میں ایسے ایسے نوادر آتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ پھر امتحان کے داخلے کا موسم آتا ہے تو عقل کے دنگ ہونے کے علاوہ ذہن کو بھی زنگ لگ جاتا ہے۔ یہ بڑی بلا کے دن ہوتے ہیں۔ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ اگر دکھائے تو جان کنی کی یہ گھڑیاں آسان کر دے۔ بعض "دور اندیش" طلباء ہیں غم تنہائی میں گھلتے رہتے ہیں۔ ہر وقت ایسی رقت طاری رہتی ہے کہ طبیعت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ایام میں طلبہ کی حالت بہت ہی پتلی ہوتی ہے۔

میرے کچھ ایسے دوست بھی ہیں جو ایک مدت سے یہاں ہی "مقیم" ہیں ——— وہ شومئی قسمت سے ابھی تک داخلے کے چکر سے بے نیاز نہیں ہوئے۔ اور ان کی حالت زار دیکھ کر مجھے واہگہ کے راستے پاکستان میں داخل ہونیوالے مہاجرین یاد آ جاتے ہیں ———!

کچھ دن تو کالج مجسم داخلہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس موضوع پر ہر طرف بحث کی جاتی ہے۔ ہر طالب علم بے سمت بے کارواں ہو کر ادھر ادھر گھومتا ہے۔ دفتر ناظم امتحان اور بڑے دفتر کے درمیانی راستے پر بھیڑ ہو جاتی ہے ———!

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ان دنوں سٹاف روم میں "ٹریفک" زیادہ ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جنید صاحب نے "ون وے ٹریفک" کے لیے بڑے دفتر سے ایک نوٹس بھی لکھوایا۔ مگر داخلے کے ایام میں سٹاف روم روڈ پر خوب چہل پہل ہوتی ہے اور سٹاف روم کے "یاتریوں" کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے۔ "برہمن" لوگ تو کسی نہ کسی طریقے سے اندر چلے جاتے ہیں۔ مگر "ویش" "کھتری" ——— اور "شودر" دیواروں کو چھو کر ہی مطمئن ہو جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دیواروں کے کان ہوتے ہیں ——— میں اس کو نہیں مانتا۔ لیکن ان ایام میں سٹاف روم کی دیواروں کے قریب، ہجوم خلق کے اژدہام سے متاثر ہو کر اتنا مان گیا ہوں کہ اور دیواروں کے کان ہوں یا نہ ہوں سٹاف روم کی دیواروں کے ضرور کان ہیں!!

یہ "آرٹ" کا زمانہ ہے ——— چنانچہ ان دنوں

کالج کے در و دیوار پر "تجریدی آرٹ" کی نمائش ہو جاتی ہے۔ یعنی طلبہ اپنے خیالات کا اظہار "بذریعہ چاک" کرتے ہیں! میں نے اتفاقاً ایک کلاس روم میں جھانکا تو "یتیموں کی فریاد" پر نظر پڑی ------ بڑے درد بھرے لہجے میں جلی حروف میں لکھا تھا ------

"ہائے اللہ جی ہمارے داخلے"

"ڈیبیٹ"

"ڈیبیٹ" کے متعلق ہمارا عقیدہ ہے کہ "اول بیٹ بعدہٗ ڈیبیٹ" ------ مگر حضرات! اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب تک ڈنر میں ٹھونس نہ کئے جائیں ------ ڈیبیٹ کا مقاطعہ کیا جائے ------ یہ تو بڑی تنگ ظرفی ہے۔ اس قول کا مفہوم صرف اتنا ہی ہے کہ کھانا کھا کر نہایت مطمئن ہو کر ڈیبیٹ میں جانا چاہیئے۔ تاکہ وہاں تقاریر کو بغور سنا جا سکے۔ نیز مقررین کا "حدود اربعہ" اطمینان سے ملاحظہ ہو سکے۔ اور حسب ضرورت حوصلہ افزائی بھی ہو سکے ------ اس قول کا عملی پہلو یہ ہے کہ وہاں جا کر جو وقت انتظار میں برباد ہوتا ہے اُسے گھر پر کھانے پینے میں بسر کرنا چاہیئے۔

آج "انتظار" پر کچھ لکھنے کو جی چاہ رہا ہے -

ڈیبیٹ بڑی اچھی چیز ہے کس بدباطن کو اس کی افادیت سے انکار ہے؟ بلکہ میرے نزدیک ہر وہ چیز "اچھی" اور "کامیاب" ہے جس میں شرکت "بذریعہ پاس" ہو ------ ہماری قوم کچھ ایسی ہے کہ "بذریعہ پاس" پہ مرتی ہے۔ کوئی جلسہ ہو یا کوئی مشاعرہ ------ اگر کہہ دیا جائے کہ داخلہ بذریعہ پاس ہوگا۔" تو بڑے بوڑھے تو الگ رہے چھوٹے بچے بھی پاس لینے بھجوائے جاتے ہیں ------ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ تو ذوق کی نشانی ہے ------ مگر اس تصویر کے دوسرے رخ کو کہاں لے جائیں کہ اگر "بذریعہ پاس" کی قید نہ ہو تو جلسے ویران ہو جاتے ہیں اور کرائے پر بھی آدمی نہیں ملتے۔ بہرحال "بذریعہ پاس" میں بڑی تاثیر ہے ------

------ بات "انتظار" سے چلی تھی۔ اس سے میری مراد صرف اتنی ہی ہے کہ بے چارے زائرین وقت مقررہ سے پہلے پہنچ کر انتظار کی صبر آزما گھڑیاں گنتے رہتے ہیں ------ ڈیبیٹ کے سلسلے میں ہمارے ہاں یہ روایت چلی آتی ہے کہ ڈیبیٹ وقت مقررہ سے ضرور لیٹ ہو ------ یونین کے پردھان شاید لیٹ پہنچتے ہیں ------ اور ان کے لیٹنے کی وجہ سے ڈیبیٹ بھی لیٹ ہو جاتی ہے!

ہم نے مغرب کی تقریباً ہر چیز لے لی ہے پینٹ بھی فٹ کرالی ہے۔ سو ہیٹ بھی سر پر چڑھا لی ہے ------ اگر کوئی چیز لینے سے رہ گئی ہے تو وہ ہے ------ "وقت کی پابندی"! اگر زندہ قوم کی یہ نشانی ہوتی ہے کہ وہ وقت کی پابندی کی کسی قیمت پہ قائل نہیں ہوتی تو پھر میرا ایمان ہے کہ ہماری قوم نے آب حیات پیا ہوا ہے!!

بات یہ تھی کہ ڈیبیٹ دونوں دن مبلغ ایک ایک گھنٹہ لیٹ ہوئی۔ شکر ہے کہ یہ "درخشندہ روایت" ابھی تک برقرار ہے -!

پہلے یونین کی باگ ڈور خلیق خانانی کے ہاتھ میں ہوتی تھی؛ اب حضرت شاہ جی کے ہاتھ میں آئی ہے۔ چونکہ شاہ جی کا پہلا تجربہ ہے اسلئے یہی مناسب ہے کہ تنقید کے "جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ رہیں"۔ البتہ شاہ جی کی خدمت اقدس میں اتنا ضرور عرض ہے ------ ؎

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

لیکن "ترخ بالا کن" کا یہ مطلب نہیں کہ اگلے سال مباحثہ تو ایسا ہی ہو اور ڈبیٹ کی ٹکٹوں کی قیمت مقرر کر دی جائے —— ! "ارزانی" کا اشارہ ڈنر کے دعوت ناموں کی ارزانی کی طرف ہے —— ڈبیٹ کے ایام میں یونین کے "لنگر خانے" نے وسیع پیمانے پر کام کیا۔ چنانچہ امسال مہمانوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ تھا —— اللّٰھم زد فزد لیکن خدا کرے یونین فنڈ میں اضافہ نہ ہو جائے!!

سٹیورڈز —— (Stewards)

ہائے سے

"زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا"
کہ ہاتھ میں نے اٹھائے ہیں بددعا کے لئے

آپ سب کو سٹیورڈز سے واسطہ پڑا ہوگا۔ اگر نہیں تو عنقریب یہ سعادت بھی نصیب ہو جائے گی۔ ڈبیٹ —— مشاعرہ —— اور اسی قسم کی دوسری ثقافتی یا تعلیمی سرگرمیوں میں بعض عمدہ قسم کے "پہاڑ" "سٹیورڈز" کے طور پر استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ خیر سے ہمارے شاہد احمد صاحب بھی ایسے ہی ایک پہاڑ تھے! ویسے ان حضرات کا عام طلبہ سے "حدود اربعہ مختلف نہیں ہوتا" البتہ ذرا "آب و ہوا" کا فرق ہوتا ہے۔ یہ عارضی فوج "نقضِ امن" کا باعث بننے والے گوریلے نوجوانوں کا مناسب انتظام کرتی ہے۔ اس فوج کی اہمیت کا میں دل سے معترف ہوں۔ ان کا کام نہایت اہم ہے کیونکہ بعض لاتوں کے بھوت بھی ایوان میں در آتے ہیں —— میں صرف اتنا احتجاج کرتا ہوں کہ باتوں کے بھوتوں کو لاتوں کی بجائے باتوں سے سمجھانا چاہیئے —— مجھے جس چیز کا قلق ہے وہ ہے یہ جانچتے —— ناجائز دباؤ —— غیر معمولی غرور۔ ان کی گردن شریف میں زاویہ قائمہ پیدا ہوتی ہے! لیکن پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ فرسٹ ایئر کے ایک سٹیورڈ صاحب میرے پاس آئے —— اور مجھے خاموش پا کر کچھ پریشان ہوئے —— چنانچہ میں بھی "پریشان" ہوا۔ اس پر انہوں نے فرمایا ——

"Be Careful in
future otherwise
I'll turn you out"

—— میں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت سنجیدگی سے "جزاک اللہ" کہنے کے بعد انہیں بڑے پیار سے اپنے پاس بٹھایا۔ اور پھر توجہ دلانے کے بعد کہا —— "مجھے یہ تو معلوم ہی ہے کہ سٹیورڈز صاحبان کو "ریفریشر کورس" میں یہی فقرہ حفظ کرایا جاتا ہے —— مگر آپ کو اس کا استعمال نہیں سکھایا گیا؟"

انہوں نے کہا۔ "آپ کا مطلب؟" —— لیکن کچھ مسکرائے۔

میں نے عرض کیا: "اس وقت بولی تو اسلامیہ کالج قصور کے مقرر رہے ہیں۔ میرا کیا قصور ہے؟"

"آپ شور مچانے کا ارادہ کر رہے تھے" انہوں نے فرمایا۔

میں نے کہا "میں فقیر آدمی ہوں۔ میں کچھ نہیں کرتا۔ آپ رحم کریں اور یہاں سے چلے جائیں ورنہ آپکی سادگی پر یہاں سیٹ پر ہی مر جاؤں گا اور پولیس کے سامنے آپ جواب دہ ہوں گے۔" یہ کہہ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں اور لیٹنے لگا —— وہ ڈرنے لگے کہ یہ تو سچ مچ گیا —— اور رخصت ہو گئے!! اس طرح بھی کئی مرتبہ جان بچانا پڑی!!

مرزا فرحت اللہ بیگ کہا کرتے تھے "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"۔ میری بھی آرزو رہی کہ "مجھے ان سٹیورڈ صاحبان سے بچاؤ"۔

"مُشاعرہ"

مشاعرے ہوتے ہی ہیں۔ مجھے بھی یاد ہوگا لیجئے ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مشاعرے میں شعراء اپنا کلام سناتے ہیں۔ کلام کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں اور مشاعروں میں جو کلام سنایا جاتا ہے وہ کوئی "اتنا اچھا" بھی نہیں ہوتا ——— یہی وجہ ہے کہ لوگ داد کے "ڈونگرے" برساتے رہتے ہیں ——— خدا کا شکر ہے کہ یہ داد کے ڈونگرے پتھر یا لوہے کے تیار شدہ نہیں ہوتے، ورنہ مطلع کے بعد ہی بے چارے شعراء کا اپنا مقطع ہو جائے۔

ایک وقت تھا جب لکھنؤ اور دلی وغیرہ میں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ مگر اب تو گلیاں اور بستیاں میں بھی مشاعرے ہونے لگے ہیں۔ یہاں بھی کبھی کبھی مشاعرہ ہو جاتا ہے مگر باہر تو آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے ہیں۔

بعض شعراء نے بے شک ہوشربا گرانی کی وجہ سے اپنا Rate بڑھا کر مشاعروں کی قدر و قیمت میں اضافہ بھی کیا ہے مگر کئی تو اتنے اللہ لوک ہیں کہ اگر چائے پینے کے لئے کسی کیفے میں جاتے ہیں تو وہاں بھی مشاعرہ شروع کر دیتے ہیں ——— اگر پان لینے گئے تو پان لینے سے قبل اسی دکان کے تختے پر ہی مشاعرے کا افتتاح کر دیا۔ اگر میرا بس چلے تو ایسے شاعروں کو پان میں تمباکو کی بجائے افیون بھر کر دوں!۔

اس صورتِ حال کے بیان کرنے سے میری مراد یہ ہے کہ مشاعروں کی کثرت ہو گئی ہے۔ اگر سیلاب آتا ہے تو ریلیف کمیٹی اپنا مشاعرہ منعقد کرتی ہے۔ اگر کہیں زلزلہ آ جاتا ہے تو انجمن امدادِ مظلومانِ زلزلہ کی "خوشی" میں مشاعرے کا اہتمام کرتی ہے۔ اور تو اور اب ریڈ کراس سوسائٹی بھی اپنے ایام میں امدادی مشاعرہ رچانا شروع کر دیا ہے۔ اہلِ ذوق کے حلقوں کا ذکر ہی کیا" جتنے شاعر اتنے مشاعرے اور جتنے منہ اتنی ہی باتیں ——— ہم نے دیکھا ہے اور سنا ہے کہ لوگ داد دیتے ہیں۔ اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ روکے یا ٹوکے۔ مگر یہاں ٹوکنا تو درکنار اگر سٹیورڈ صاحبان کا بس چلے تو ڈنکے سے زبان ہی کاٹ لیں ——— مشاعرے کو میں تو مشاعرہ ہی سمجھتا ہوں۔ ویسے اسے "نمازِ تراویح" کا مرتبہ دینا صرف بدذوقی ہی نہیں بلکہ گناہ بھی ہے!۔

اہلِ ذوق کے مشاعروں کے بعد کالجوں کے مشاعروں کا نمبر آتا ہے۔ کالجوں کی آب و ہوا کچھ ایسی گرم مرطوب واقع ہوتی ہے کہ اچھا بھلا آدمی بھی شاعر بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کالج شاعروں کے وجود سے پاک نہیں ہوتا۔ ربوہ کی زمین تو شور اور کلر کی وجہ سے پہلے ہی "شاعر خیز" ہے ——— بھلا یہاں کیوں قلت ہو؟

ایک زمانے میں کالج یونین مشاعرے کرایا کرتی تھی۔ بلکہ مجھے یونین کی وساطت سے ہی "مشاعرے" اور "داد" کے مفہوم کا علم ہوا۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ جب خاکسار فرسٹ ایر میں تھا تو ایک بڑا بھاری مشاعرہ جناب سالک مرحوم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں بڑے بڑے شاعر اور متشاعر آئے اور کلام سنایا۔ اس

وقت مجھے نہ مشاعرہ سُننے کی تمیز تھی نہ شعر سمجھنے کی طاقت۔ لوگ "سُبحان اللہ" "ماشاء اللہ" "واللہ الہام ہے" ـــــ کچھ سامعین نے جب "واہ ۔ وا ۔ وا ۔ واہ" کی آواز نکالی تو میں حیران ہوا کہ یہاں تو لوگوں کو کھانسی بھی "حسرت" "حسرتا" "حسرتو" آ کے وزن پر آتی ہے لیکن میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب پتہ چلا کہ یہ تو داد کے مختلف لہجے ہیں۔ خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے ۔ چنانچہ میں نے اُن کی دیکھا دیکھی ثواب کے لئے داد دینا شروع کی ۔ یہ میری زندگی کا پہلا مشاعرہ تھا ـــــ اور پہلی داد! چنانچہ ایک شاعر صاحب نے جب مُنہ کی بجائے ناک سے غزل سُنانا شروع کی تو میں نے لوگوں کے تتبع میں "واللہ الہام ہے" کے وزن پر "واللہ زکام ہے" کہہ دیا ۔ اسی طرح کچھ اور اوزان بھی وضع کئے ۔ لوگ خوب ہنسے مگر سٹیورڈز حضرات مجھے گھورنے لگے ـــــ

تاہم اُس دن علم ہوگیا کہ اس قسم کے فقروں کو "داد" کہا جاتا ہے ۔ پھر لاہور، کراچی اور پشاور کے بعض مشاعروں کو سُن کر یقین ہوگیا کہ مشاعرے کے وقت شاعر کی اس طرح حوصلہ افزائی کرنا کارِ ثواب ہے ۔ چنانچہ میں آج تک اس پر قائم اور کاربند ہوں ۔ اور نہیں جانتا کہ میرے نام اب تک کتنا ثواب درج ہو چکا ہے !!

* * *

ڈیبیٹ کے دنوں میں ہی ایک آل پاکستان انٹر کالجیٹ مشاعرہ بھی ہوا ۔ اس مشاعرے میں جانے کا اتفاق ہوا ۔ حُسنِ اتفاق سے ہم بچ کر آ گئے ۔ ورنہ ممکن تھا کہ عالمِ وجد سے ہی عالمِ بالا کا رُخ کرتے ۔!

وقت کی پابندی نہ کرنے کا رونا ڈیبیٹ میں رو آیا ہوں ۔ اب حصولِ ثواب کی نیت سے ایک مرتبہ پھر رو لیتا ہوں ۔ اگر ڈیبیٹ وقت مقررہ پہ ہونے سے قاصر ہے تو بے چارے مشاعرے کو کیا تکلیف ہے کہ وہ وقت مقررہ پہ ہی ہو ۔ چنانچہ ڈیبیٹ اگر ایک گھنٹہ لیٹ ہوا تو مشاعرہ ڈیڑھ گھنٹہ ـــــ اسی طرح اُردو سوسائٹی نے ڈیبیٹ کو ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ ہم بھی کسی سے پیچھے نہیں!

* * *

اس مشاعرے کا تفصیلی جائزہ تو ایڈیٹر صاحب ہی لیں گے ۔ مجھے تو فقط ایک زائر کی حیثیت سے آپ بیتی سُنانا ہے ۔ جب دروازہ کھُلا تو عاجز ایک کونے میں بھیگی بلی بن کر دم سادھ کر بیٹھ گیا ـــــ "مکو" دلی دا ولی سے سُنا ہے ـــــ چنانچہ نجمی صاحب "ظفر محمود اینڈ" کو بھی آ گئے ۔ خوشی ہوئی کہ حوصلہ افزائی کیلئے ہماری جماعت ایک مرکز پہ جمع ہو گئی ۔ مگر دیکھتے دیکھتے ساون کی بدلیوں کی طرح سٹیورڈز صاحبان بھی آ گئے ۔ ہم

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا!

ابھی مشاعرہ شروع ہونے میں کچھ دیر تھی ۔ ادھر وقت کٹی کیلئے ہم نے "مشاعرے میں داد دینا جائز ہے یا ناجائز" کے موضوع پہ سٹیورڈز سے مناظرہ شروع کر دیا ۔ قریب تھا کہ مباحثے کی صورت پیدا ہو جاتی ۔ مگر ادھر مشاعرہ شروع ہو گیا ۔ اپنے کالج کے شعراء نے غزلیں سُنانا شروع کیں ۔ مگر جب ہم نے دیکھا کہ سامعین بہت زیادہ "کفایت شعار" ہیں اور داد دینے کے معاملے میں بخل سے کام لے رہے ہیں اور ایسی شرمیلی اور طرزِ تغافل سے شعراء کو ٹھوکر لگنے کا احتمال ہے ۔ ادھر یہ ہو چکا کہ وہ شعر جو غالب کو بھی نہ سوجھے تھے یونہی ہوا میں تحلیل ہو رہے ہیں سچی بات ہے کہ ہم سے صبر نہ ہو سکا اور اس بیداد پہ داد دیئے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ ہم نے دل کے پھپھولے اور مُنہ کھول کر "باجماعت" داد دی ۔

اچھا یار زندہ صحبت باقی !!

ریحان پرویز
فورٹ ابیہ

"ظلم سے کر توبہ!"

اندھیری رات اور غضب کی سردی تھی نیلگوں آسمان گہرے کالے بادلوں کی چادر کی لپیٹ میں آچکا تھا کبھی کبھی بادل اس طرح گرجتے جیسے محاذِ جنگ پر توپیں آتش گولے اگل رہی ہوں اور دھرتی کی ہر چیز پل بھر کے لئے دہل جاتی۔ رات کی بھیانک سیاہی اپنی تمام ظلمت کے ساتھ کائنات کی ہر چیز کو اپنی آغوش میں لئے میٹھی نیند سو رہی تھی۔ لیکن جب چند لمحوں کے لئے بجلی چمکتی تو دور دریا کے اُس پار جنگل میں ایک ننھی سی کٹیا اپنے وجود کا ثبوت دیتی اور پھر رات کی تاریکی میں آنکھ مچولی کھیلتے گم ہو جاتی۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کٹیا کے دروازے پر کسی کی دستک دینے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ کچھ دیر کے بعد ایک سفید ریش بوڑھا جوگی ہاتھ میں ٹمٹماتی ہوئی مشعل لئے دروازہ کھولتا ہے۔ عین اس وقت بجلی چمکتی ہے اور بوڑھا جوگی بھیگے ہوئے کپڑوں اور بکھرے ہوئے بالوں والے ایک نوجوان کو سامنے کھڑا پاتا ہے۔

بہت مدت کے بعد انسان کو دیکھ کر بوڑھے جوگی کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھتا ہے۔ "بیٹا! جلدی جلدی اندر آجاؤ سردی بہت ہے۔ اِس کو اپنا ہی گھر سمجھو معلوم ہوتا ہے اندھیری رات میں کہیں راستہ کھو گئے ہو!" بوڑھا جوگی ایک ہی سانس میں یہ تمام باتیں کہہ گیا۔

نوجوان بوجھل قدموں کے ساتھ کٹیا کے اندر داخل ہو گیا۔ کٹیا کے اندر آگ کا الاؤ روشن تھا۔ نوجوان آگ کے پاس ایک بوریا پر بیٹھ گیا۔

بوڑھے جوگی نے سردی سے بچاؤ کے لئے اس پر ایک موٹا کھردرا کپڑا ڈال دیا۔ "بیٹا! اتنی اندھیری رات میں اِس طرف کیسے نکل آئے؟ کوئی دکھیا انسان معلوم ہوتے ہو۔ کیا مجھے اپنے متعلق کچھ بتاؤ گے؟" بوڑھے جوگی نے آگ کے الاؤ پر سوکھی لکڑیاں ڈالتے ہوئے نوجوان سے پوچھا جو ابھی تک اداس صورت بنائے آگ کے شعلوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ بوڑھے جوگی کی آواز پر چونکا اور آگ کے شعلوں سے نظر ہٹاتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

"میں یہاں سے کچھ دور ایک گاؤں کا بدنصیب رئیس ہوں۔ نیک دل باپ کے مرنے کے بعد گاؤں کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ اقتدار کی ہوس میں خدا اور انسانیت کو بھلا دیا۔ شراب اور دولت کے نشہ میں بے گناہ اور معصوم گاؤں والوں پر دل ہلا دینے والے ظلم کئے۔ اُن کے گھروں کو لوٹا۔ اُن کی عزت کو سرِ بازار نیلام کیا۔ کسی کو مجھے روکنے کی جرأت نہ پڑی۔ فریادی کی فریاد کو اپنے اقتدار کی توہین سمجھ کر اس کو ہمیشہ ہمیشہ

کے لئے دبا دیا۔ گاؤں سے کچھ دُور ایک نیک سیرت خدا کا بندہ دُنیا کے کاموں سے بے نیاز خدا کی حمد و ثنا میں محو رہتا تھا۔ مظلوم گاؤں والوں نے اُس سے التجا کی کہ وہ مجھے ان ظالمانہ کاموں سے روکے۔ اس خدا کے نیک بندے اور بزرگ نے مجھے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی مگر میں نے ان کی باتوں پر کوئی دھیان نہ دیا بلکہ اُلٹا اس کی باتوں کا تمسخر اُڑایا۔ دولت نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی، میں نے اس کو بھی اپنے اقتدار اور ظلم کی راہ میں ایک روڑا سمجھتے ہوئے قتل کروا دیا۔ غریب اور معصوم گاؤں والوں پر ظلم و تشدد اور زیادہ کر دیا۔ . . . .

. . . . "مجھے بچاؤ! بچاؤ! وہ دیکھو بزرگ کی روح ہاتھ میں گُرز لئے مجھے مارنے کے لئے بڑھ رہی ہے۔" نوجوان یہ کہتا ہوا ڈر کے مارے بوڑھے جوگی سے چمٹ گیا۔

بوڑھے جوگی نے دلاسا دیتے ہوئے کہا "بیٹا! یہاں پر تمہیں کوئی رُوح کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ڈرو مت، اپنی داستان جاری رکھو۔"

نوجوان نے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ پھر اپنی داستان شروع کی: "میں نے خواب میں دیکھا اس خدا کے نیک بندے کی روح ایک دیو ہیکل آدمی کا رُوپ دھارے ہاتھ میں آہنی گُرز لئے مجھے مارنے کے لئے میری طرف بڑھ رہی ہے اور کہہ رہی ہے "اے ظالم! اب اپنی دولت سے کہو کہ تجھے میرے گُرز سے بچائے۔ اپنے انجام کے لئے تیار ہو جا۔" اُس نے مجھے مارنے کیلئے گُرز اٹھایا ہی تھا کہ ڈر اور خوف سے میری آنکھ کھل گئی۔ اس خواب کے بعد ہر وقت مجھے اس طرح معلوم ہونے لگا جیسے بوڑھے بزرگ کی رُوح کا رُوپ دھارے سینکڑوں آدمی ہاتھوں میں گُرز لئے مجھے ہمیشہ ہمیش کیلئے کُچل دینے کے لئے چاروں طرف سے بڑھ رہے ہیں۔ میری راتوں کی نیند اور دن کا آرام چھن چکا ہے۔ میں گاؤں والوں کے گھروں میں اپنے گناہوں کی تلافی کے لئے بھی گیا ہوں مگر آہ! اُن کے دل بھی معافی کے جذبے سے خالی ہو چکے ہیں۔ وہ پتھر کے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ ہر وقت مجھے یہی کہتے "کہاں گئی تمہاری دولت و اقتدار جس کا تمہیں اتنا مان تھا۔ تو نے ہمارے بستے گھروں کو برباد کیا، ہماری خوشیوں کو لوٹا۔ اب جاؤ اور اپنی دولت ہی سے زندگی کا سکون مانگو۔" میری عزت، میری آن ـــــ مٹی میں مل چکی ہے ـــــ مجھے اپنے وجود سے نفرت ہو گئی ہے۔ مگر میں اس کٹیا میں کب آیا، بابا! مجھے بتاؤ کون مجھے یہاں لایا ہے؟" اس نے بوڑھے جوگی کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا "مجھے اس دُنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے مجھے مر جانا چاہیئے۔"

بوڑھے جوگی نے ہمدردانہ لہجے میں اُسے بتایا کہ "خدا تعالےٰ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ تمہاری دُکھیا اور بے چین روح کا علاج ندامت، توبہ اور استغفار میں ہے۔ اُٹھو اور اپنے مالکِ حقیقی سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور عزم کر لو کہ یہاں سے واپس جا کر تم ایک نئے انسان بنو گے اور تمہیں ایک نیا جنم ملا ہو گا۔"

جوگی کی ان باتوں سے اس کے بے چین قلب میں سکون پیدا ہونے لگا۔ اُسے سخت تاریکی میں امید کی کرن کی جھلک دکھائی دینے لگی اور وہ آرام کی نیند سو گیا۔ ∴

عبدالشکور اسلم

مسلمانوں کا علومِ فلکیات میں حصہ

سائنس کی موجودہ ترقی دیکھ کر اکثر لوگوں کے دلوں میں مذہب سے دلچسپی کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کیونکہ ان کی کوتاہ بینی سے انہیں مذہب سائنس سے ٹکراتا نظر آتا ہے لیکن تھوڑے سے تدبر سے صاف نظر آتا ہے کہ مذہبِ اسلام نہ صرف سائنسی علوم سے ٹکراتا ہی نہیں بلکہ ان علوم کا حاصل کرنا مومن کے فرائض میں داخل کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے یتفکّرون فی خلقِ السمٰوٰتِ والارض۔ انّ فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الّیل والنھار لاٰیٰتٍ لاولی الالباب افلا تدبرون ۵ وغیرہ مختلف جگہوں پر ارشاد فرما کر مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ فرائضِ دینی کے ساتھ ساتھ تمام قسم کے علوم دنیوی بھی حاصل کریں۔

اس عمومی ذکر کے علاوہ مختلف مواقع پر مختلف علوم مثلاً نباتات، حیوانات، نجوم، فلکیات، طبیعات وغیرہ کا بھی ذکر کر دیا تاکہ مسلمانوں کو مزید رہنمائی ہو سکے چنانچہ قرونِ اولیٰ اور قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں نے اس ارشادِ خداوندی کی بجا آوری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

یورپین ممالک جو آج اپنی علمی ترقی پر نازاں ہیں اور اسی گھمنڈ میں بڑی جرأت کے ساتھ خدا کی خدائی کے منکر ہو رہے ہیں انہیں شاید اپنی گزشتہ تاریخ بھول چکی ہے کہ یہ سب علوم انہوں نے مسلمانوں سے ہی سیکھے۔ مسلمانوں نے تمام علوم اپنے آسمانی آقا کے ارشاد کی بجا آوری میں سیکھے۔ اور یہ بھی اس وقت جب کہ مسلمان نئے نئے علوم کی بنیادیں رکھ رہے تھے، عیسائی پادری ہر نئے علم کو عیسائیت کی تعلیم کے خلاف سمجھ کر اس علم کی اشاعت کرنے والوں کے متعلق جیل میں بھجوائے جانے کا فتویٰ صادر کر رہے تھے۔ چنانچہ پروفیسر ایچ۔ اے ڈیویز اپنی کتاب An Outline History of the World میں لکھتے ہیں:-

> "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد پانچ سو سال کے اندر ان کے ماننے والوں نے ایک ایسی تہذیب کی بنیاد ڈالی جو اس نظام سے کہیں ارفع و اعلیٰ تھی جو اس وقت یورپ میں رائج تھا ———— انہوں نے ایسی ایسی عظیم یونیورسٹیاں اور درسگاہیں قائم کیں کہ یورپ کے تعلیمی ادارے صدیوں ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ان میں بغداد، قاہرہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیاں خاص طور پر مشہور تھیں ...... قرطبہ کی یونیورسٹی میں بہت سے عیسائی طلبہ بھی پڑھتے تھے۔ وہ علم حاصل کرنے کے بعد جب اپنے ملکوں کو واپس

گئے تو ان کے ذریعہ ان ممالک میں بھی علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کا چرچا ہوا ...... دُنیائے سائنس بڑی حد تک مسلمانوں کی مرہونِ منت ہے۔ انہوں نے عربی ہندسوں اور اعداد کا علم ایجاد کیا۔ الجبرے کا علم تو گویا انہیں کے دماغ کی اختراع ہے۔ انہوں نے علم مثلث (Trignometry) علم بصریات اور علم نجوم کو ترقی دی۔ Pendulum ایجاد کیا اور علم طب کو عروج پہ پہنچایا۔ مختلف امراض کے علاج کے جو طریقے انہوں نے ایجاد کئے اُن میں سے بعض آج کے دن تک رائج چلے آرہے ہیں۔ ایسے وقت میں جب کہ یورپ میں کلیسا نے دواؤں کا استعمال ممنوع قرار دے رکھا تھا اور جھاڑ پھونک کے ذریعہ بھوت کو بھگانا ہی بیماریوں کا بہترین علاج سمجھا جاتا تھا اور یورپ میں نیم حکیم بکثرت تھے مسلمانوں کے ہاں طبی سائنس کا حقیقی علم موجود تھا ...

.... یورپ میں کاغذ کی صنعت کے فن کو ایجاد کرنے والے مسلمان ہی تھے ..... اگر اُن کے ذریعہ کاغذ فراہمی نہ ہوتی تو یورپ میں تعلیم کا وسیع نظام قائم ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔"

اسی طرح مسٹر H. G. Wales اپنی کتاب Outlines of History میں مسلمانوں کی یونیورسٹیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"عرب فلسفہ کا پیرس، آکسفورڈ، شمالی اٹلی اور مغربی یورپ کے مکاتیبِ خیال پر بلاشبہ گہرا اثر پڑا۔"

مسٹر Horace Shipp اپنی کتاب Books that Moved the World میں قرآن کریم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس (قرآن کریم) کے ذریعہ ایک ایسی شاندار ثقافت معرضِ وجود میں آئی جس میں مشرق و مغرب کا علم سمویا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے علم ریاضی، علم نجوم، علم کیمیا، علم طب، علم اشکال (جیومیٹری) اور دیگر سائنسی علوم میں بے انتہا ترقی ہوئی ..... عربوں نے ہندسوں کا جو علم ایجاد کیا اس نے لاطینیوں کے پیچیدہ سسٹم کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا اور اس طرح ریاضیات میں ترقی کی نئی راہیں کھلیں۔"

مسٹر Bertram Thomas اپنی کتاب "The Arabs" میں لکھتے ہیں:-

"قرونِ وسطیٰ کا زمانہ عربوں کے
سائنسی علوم اور اُن کی شہرت سے گونج
رہا تھا۔"

پس مغربی مفکرین بھی ہمارے ساتھ اِس امر پر متفق ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے زمانۂ عروج میں علم و فضل کے دریا بہادیے اور اِس کا محرک خدا تعالیٰ کا کلام قرآنِ حکیم تھا۔

مسلمانوں نے جو علوم کے مدفون خزانے باہر نکالے اُن کی تفصیل کے لئے دفتروں کے دفتر درکار ہیں لیکن اِس وقت ہم صرف اُن کارہائے نمایاں کا ذکر کریں گے جو مختلف مسلمانوں نے علومِ فلکیات کے سلسلہ میں سرانجام دیئے۔

علومِ فلکیات کی طرف مسلمانوں نے صحیح معنوں میں سنہ ۷۷۱ء میں توجہ دینی شروع کی۔ چنانچہ سب سے پہلے محمد بن ابراہیم الفزاری نے ہندوؤں کی ایک قدیم علمِ فلکیات سے متعلق کتاب "سدھانت" کا عربی میں ترجمہ کیا اور حجاج بن مطر اور حنین بن اسحاق نے یونانیوں کی کتاب "المجسطی" کا عربی میں ترجمہ کیا۔ تراجم کے بعد ان کتب میں بیان کردہ علوم پر انہیں لوگوں نے تجربات کرنے شروع کئے۔ تجربات کے لئے سب سے پہلی رصدگاہ جنوب مغربی ایران کے ایک علاقہ Jundaysabur میں قائم کی گئی۔ تجربات کرنے کے بعد ان پر رسالہ جات لکھے گئے۔

خلیفہ مامون نے علومِ فلکیات پر تجربات کرنے کے لئے بغداد کے شمسیہ دروازے کے نزدیک ایک شاندار رصدگاہ بنوائی اور سند ابن علی، یحییٰ ابن ابی منصور اور دوسرے مسلمانوں کو تجربات کرنے کے لئے مامور کیا۔ چنانچہ سورج، چاند اور ستاروں کی حرکات کی پیمائش کی گئی۔ تجربات کے بعد مدارِ شمسی کا ترچھا پن ثابت کیا گیا اور شمسی سال کی لمبائی معلوم کی گئی۔ اسی طرح اُن اوقات کی تعیین کی گئی۔ جب سورج خطِ استوا پر ہوتا ہے اور دن رات برابر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ "المجسطی" کی بیان کردہ باتوں پر تجربات کئے گئے اور ان تجربات کے ذریعہ ان کو "درست یا غلط" ثابت کیا گیا۔ مامون کے عہد میں سب سے اہم کارنامہ زمین کے محیط کو ناپنا تھا۔ چنانچہ موسیٰ بن شاکر کے بیٹوں اور الخوارزمی نے Euphrates کے شمالی جانب Sinjar اور Palmyra کے درمیانی فاصلہ ناپا۔ ان دونوں جگہوں کا فاصلہ ایک درجہ طول بلد تھا۔ زمین میں ۳۶۰ درجے طول بلد کے ہیں اور اس فاصلہ کو ۳۶۰ سے ضرب دی گئی۔ چنانچہ ایک درجہ کا فاصلہ ⅔۵۶ عربی میل ہوا۔ اس کو ۳۶۰ سے ضرب دی گئی اور زمین کا محیط ۲۰۴۰۰ میل نکالا گیا جو اصل محیط سے قریباً ۴ ہزار میل کم ہے۔ اور اس غلطی کی بڑی وجہ آلات کی کمی، محدود ذرائع اور اس بات کی لاعلمی تھی کہ زمین پوری طرح گول نہیں ہے۔ اس کارنامہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب کہ ٹھیک اسی زمانہ میں یورپین ممالک میں پیمائش تو الگ رہی جو کسی نے زمین کے گول ہونے کا ذکر کیا اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ کیونکہ یہ مذہبی عقائد کے خلاف تھا۔

دو سو سال بعد سپین اور دوسرے ممالک کے ماہرینِ فلکیات نے انہی تجربات پر بنیاد قائم کرکے مزید تجربات کئے اور مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔

بیان کردہ رصدگاہ کے علاوہ مامون نے ایک اور رصدگاہ دمشق کے باہر قاسیون کے مقام پر بنوائی۔

ان رصدگاہوں میں تجربات کے علاوہ مختلف آلات بھی بنائے گئے مثلاً زاویہ ماپنے کا آلہ، سورج اور ستاروں کی بلندی ماپنے کا آلہ اصطرلاب (Astrolabe) دھوپ گھڑی، گلوب وغیرہ۔ اصطرلاب ابراہیم الفزاری نے بنایا اور بعد میں علی ابن عیسیٰ نے اس آلہ پر مختلف کتابیں بھی لکھیں۔

خلیفہ متوکل کے زمانہ میں فرغانہ کے ابو العباس ابن فرغانی نے بھی علم فلکیات کے سلسلہ میں کئی ایک کارہائے نمایاں سر انجام دیئے۔ متوکل نے فسطاط میں ایک رصدگاہ بنوائی جس کی نگرانی ابو العباس کے سپرد تھی۔ اس نے ایک کتاب "المدخل علم الھیئت الافلاک" لکھی۔ جس کے تراجم ۱۱۳۵ء میں لاطینی زبان میں John of Seville اور اطالیہ کے Gerard of Cremona نے کئے۔ اسی طرح عبرانی اور دوسری زبانوں میں بھی تراجم کئے گئے۔

عبد اللہ محمد ابن جابر البتانی (۸۵۸ء سے ۹۱ء تک) رقہ میں ہوا۔ یہ علم فلکیات کا بہترین محقق تھا۔ اس نے سکندریہ کے مشہور و معروف ہیئت دان بطلیموس (Ptolemy) کی بہت سی باتوں کی ترامیم پیش کیں۔ چاند اور دوسرے ستاروں کے مداروں کا تجزیہ اور ان کی اصلاح کی۔ سورج اور چاند سے متعلق تجربات کئے اور ان کے ظہور کی وجوہات بیان کیں۔ ابو جعفر خازن کے تجربات میں ترامیم پیش کیں۔ محور زمین کا سطح مدار ارضی سے تعلق ثابت کیا۔ موسموں کے تغیر و تبدل کے ظہور کی وجوہات بیان کیں۔ شمسی سال کی صحیح تعیین کی۔ اسی طرح سورج کے مدار سے متعلق غلط فہمی کو دور کیا۔

خراسان کے علاقہ بلخ کے ایک مسلمان ابو معشر (۸۸۶ء) نے بغداد میں علم نجوم سے متعلق کئی ایک کتب لکھیں۔ ان کتب میں اس نے ستاروں کا انسانی پیدائش و موت اور زندگی کے دوسرے اہم واقعات سے ایک گہرا تعلق ثابت کیا۔ اسی طرح چاند کے غروب و طلوع ہونے کے ساتھ سمندری لہروں کے مد و جزر کا تعلق ثابت کیا۔ بارھویں صدی میں Johan of Seville اور Adelard of Bath نے اس کی بہت سی کتب میں سے چار کتب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ عیسائی اسے Albumasar کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور قرونِ وسطیٰ میں اس کا مجسمہ بزرگوں کے معبد میں عیسائیوں نے شامل کر رکھا تھا۔

ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی غزنی میں گزرا ہے۔ اس نے ۱۰۳۰ء میں ایک مکمل اور جامع کتاب الموسوم بہ "القانون المسعودی فی الھیئۃ والنجوم" محمود غزنوی کے بیٹے مسعود کے لئے لکھی۔ اسی طرح "التفہیم لاوائل السنۃ التنجیم"، "الآثار الباقیۃ"، "القانون التحالیہ" وغیرہ کتب لکھیں۔ جن میں زمین کی محوری گردش، زمین کی سورج کے گرد گردش، طول بلد، عرض بلد وغیرہ سے متعلق اپنے تجربات پیش کئے۔

۱۰۷۴ء میں رے (Ray) ایک رصدگاہ بنائی گئی۔ عمر خیام جسے صرف فارسی کا شاعر سمجھا جاتا ہے وہ بہترین حساب دان اور علوم فلکیات کا ماہر تھا۔ اس نے اس رصدگاہ میں تجربات کئے اور ایک کیلنڈر (تقویم) ایجاد کیا اور اس کا نام التاریخ الجلالی رکھا۔

Gregorian کیلنڈر جس کا نام یورپ کے تیرھویں پوپ کے نام پر رکھا گیا عموماً بہترین کیلنڈر

تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ Gregorian کیلنڈر میں ۳۳۳۰ سالوں میں ایک دن کی غلطی ہوتی ہے۔ مگر عمر خیام کے اس کیلنڈر میں ۵۰۰۰ سالوں میں ایک دن کی غلطی ہوتی تھی۔

ہلاکو کی آمد پر بغداد میں تباہی مچی اور اس کے رصدگاہیں بھی تباہ ہو گئیں۔ مگر اس تباہی کے ایک سال بعد ہی جھیل کے کنارے ایک اور رصدگاہ بنائی گئی۔ یہ بنو عباس کی آخری رصدگاہ تھی۔ اس رصدگاہ میں ناصرالدین طوسی نے تجربات کئے۔ اس رصدگاہ کے آلات بہت زیادہ مشہور ہیں۔ ان آلات میں چند ایک یہ ہیں :۔

گلوب جس میں خطِ استوا، خطِ سرطان اور خطِ جدی کو نلکی چوڑیوں سے ظاہر کیا گیا تھا۔ (Armillary shere)

زاویہ ماپنے کا آلہ مزولہ (Mural quadrant)، گلوب جس میں راس السرطان اور راس الجدی کو ظاہر کیا گیا تھا (Solatitial armil)

ڈھوپ گھڑی، پن گھڑی، جو پانی کے بہنے کے ساتھ چلتی تھی۔ مقیاس النور (Photometer) مزولہ انیٹوں کا بنا ہوا تھا اور اس پہ انتہائی خوبصورت نقش و نگار موجود تھے۔ ناصرالدین طوسی نے فلکیاتی جدول (Astronomical Tables) مرتب کئے جو یورپ اور ایشیا دونوں جگہ بہت ہردلعزیز ہوئے۔ ان جدولوں کو Zijal-Il-Khani کہا جاتا تھا۔

سلطان شرف الدولہ نے اپنے محل کے قریب ایک رصدگاہ بنوائی جس میں عبدالرحمٰن صوفی، احمد صاغانی، ابو الوفا وغیرہ کام کرتے رہے۔ عبدالرحمٰن صوفی نے ساکن ستاروں کے متعلق ایک مشہور کتاب "کتاب الکواکب الثابتہ" لکھی۔ اسی طرح ابو جعفر فازن نے یہ ثابت کیا کہ محورِ زمین سطحِ مدارِ ارضی پر ترچھا واقع ہے نہ کہ، قائماً یا عموداً۔

مسلمان جب سپین پر قابض ہوئے تو وہاں پہ بھی یہ تمام علوم پہنچ گئے اور اسی ملک سے مسلمانوں کے ایجاد کردہ آلات، ان کے تجربات اور ان کی کتب دوسرے تمام یورپین ممالک میں پہنچیں۔ سپین میں مشہور ماہرین فلکیات (Cordova کا) المجریطی، (Toledo کا) الزرقالی اور (Seville کا) ابن فلاح تھے۔

المجریطی نے خوارزمی کے مرتب کردہ فلکیاتی جدولوں میں کچھ تصحیح کی۔ سنہ ۱۱۲۶ء میں Adelard نے ان جدولوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ سنہ ۱۱۳۴ء میں Plato of Tivoli نے البتانی کی کتب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ الفانسو X جو سپین پر قابض ہوا اس نے بھی ان کتب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کروا دیا۔ الفانسو کو علم فلکیات کا ماہر سمجھا جاتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے صرف مسلمانوں کی کتب کا ترجمہ لاطینی زبان میں کروا دیا تھا۔

الزرقالی نے بھی خوارزمی کے جدولوں میں کچھ قدر ترمیم پیش کی اور بارھویں صدی میں انہیں جدولوں اور زرقالی اور خوارزمی کی دوسری کتب کے تراجم کئی زبانوں میں کئے گئے۔ زرقالی نے بحیرہ روم کی لمبائی ۴۲ درجے طولِ بلد بیان کی جو تقریباً درست ہے۔ خوارزمی نے ۵۲ درجے طولِ بلد اور بطلیموس نے ۶۲ درجے طولِ بلد بیان کی۔ زرقالی نے ستاروں وغیرہ کی بلندی ماپنے والے آلہ اسطرلاب (Astrolabe) کی بناوٹ میں بھی ترمیم کی اور اس کا نام "سقیحہ" رکھا۔

البتانی پہلا شخص تھا جس نے سورج اور اس کے اردگرد سیاروں اور زمین کی گردش کو ثابت کیا۔ اسی طرح اُس نے سورج سے زمین اور دوسرے سیاروں کا بلند ترین مقام دریافت کیا (Solar Apogee) اور اس کی پیمائش 12-04 فلکیاتی یونٹ ظاہر کی جب کہ اصل پیمائش 8.1 ہے۔ (فلکیاتی یونٹ ۹۲،۰۰۰،۰۰۰ میل کا ہوتا ہے)

جابر بن افلح نے اپنی کتاب "کتاب الہیئۃ" میں یہ ثابت کیا کہ زہرہ اور عطارد وغیرہ سیاروں میں کوئی parallaxes نہیں ہے۔ جب مختلف فاصلہ پر پڑی ہوئی دو چیزوں کو آنکھ کی سیدھ میں دیکھا جائے اور اس کے بعد نظر کو ایک طرف ہٹانے سے دو چیزوں میں ایک چیز ایک طرف ہٹتی نظر آتی ہے اس کو Parallax کہتے ہیں۔ دو چیزوں میں جتنا فاصلہ زیادہ ہوگا اتنا Parallax زیادہ ہوگا۔ لہٰذا دوسرے اجرام کی نسبت وہ زمین کے بہت قریب ہیں۔

یہ ہے مختصر سا تذکرہ اُن کوششوں کا جو مسلمانوں نے علوم فلکیات کے فروغ میں سرانجام دیں۔ ان مختلف ماہرین کے قلم اور ان کی کتب کے تراجم کئے گئے جو بعد میں یورپین ممالک میں پھیلے۔ اسی طرح یورپی ممالک کے طلباء نے مسلمانوں کی درسگاہوں سے علوم کی شمعیں روشن کیں اور واپس جا کر اپنے ممالک میں ان علوم کی اشاعت کی۔

ان حالات میں یہ کہنا ہرگز بے جا نہ ہوگا کہ مسلمانوں نے اپنے علوم کو اس قدر بلند کیا کہ ان کے نہ ختم ہونے والے اثرات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فلک پر قائم ہو گئے۔ آج ہر وہ انسان جو آسمان کی طرف ایک نظر اٹھا کر دیکھتا ہے اسے صاف طور پر مسلمانوں کے کام نمایاں طور پر نظر آنے لگتے ہیں اور اس کا بڑا ثبوت اجرام فلکی کے مختلف نام ہیں جو خالصتاً عربی ہیں اور انگریزی میں انہیں توڑ موڑ کر اختیار کر لیا گیا ہے۔ مثلاً عقرب (Acrab)، الجدی (Algedi)، الطیر (Altair)، ذنب (Deneb)، فرقد (Pherkad) وغیرہ۔

اسی طرح بعض Technical Terms بھی عربی زبان سے ہی لی گئی ہیں۔ مثلاً Azimuth (وہ قوس آسمانی جو سمت الراس سے اُفق تک پھیلی ہوئی ہے اور اُفق کو زاویہ قائمہ پر کاٹتی ہے) السموت سے لیا گیا ہے۔ Nadir (فلک کا وہ نقطہ جو دیکھنے والے کے پیروں کی سیدھ میں ہو) نظیر سے اور Zenith (وہ نقطہ دیکھنے والے کے عین سر پر ہو۔ یعنی سب سے بلند نقطہ) السمت سے لیا گیا ہے۔

عمر گئی ہے اُدھر بات مگر تھوڑی نہیں
تھوڑے سے اُس نے سیکڑوں وعدے وفا کئے
(غالب)

جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا
کہ تُو نے کس توقع پر وفا کی!
(مومن)

کوہستانی

نقد و نظر

انوکھے بھکاری

سنتے آئے تھے کہ حرکت میں برکت ہے، مگر ہماری حرکت ذرا گت میں تبدیل ہو گئی ——— ابھی کل ہی کی بات ہے کہ کوہستانی حرکت کرتا ہوا لائبریری میں جا بیٹھا ——— تل رکھنے کو جگہ نہ تھی مگر جیسے رکھ ہی گئی ——— ٹوپی اتار، اٹھایا اور رکھ کے ورق گردانی کرنے اور نہ جانے کتنی دیر کرتے رہے ———

خیر گھنٹی بجی، جانے لگے، مگر ٹوپی ندارد ——— نہ جانے کہاں غائب غلہ کر دی کسی نے ——— سب سے پوچھا، سب نے کانوں پر ہاتھ دھرا ——— اس پر کوہستانی تولہ ماشہ ہو گیا ——— ادھر چودھری صاحب کا ڈر کہیں (Behave) نہ کہہ دیں، ادھر جانے کا خوف ——— مرتا کیا نہ کرتا دل کڑا کر کے چیخ پڑا "آخر زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا، یہیں رکھی تھی میں نے" ——— مگر سب کانوں میں روئی ٹھونسے بیٹھے رہے ——— خون کے گھونٹ پیتا ہوا، کوستا رہا ——— پگڑی تو تھی نہیں جو دوسروں کے پیروں پر رکھتا ——— لے دے کے ایک ٹوپی تھی سو وہ بھی ہڑپ ہو گئی ——— روغن قاز کو، مگر ؎

وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا
اب عطر بھی ملو تو محبت کی بو نہیں

اب تو کوہستانی نے توتے ہوڑنے شروع کر دیئے اور بہتوں کے تھیلوں میں ہاتھ ڈلوائے ——— دوڑ دھوپ کر ہی رہے تھے کہ سعید اور طارق مل گئے اور یک زبان ہو کر فقرہ کس دیا ؎

"کیوں نعل در آتش ہوئے جاتے ہو تم حکیم"

لاچار "الف" سے لے کر "یے" تک ساری داستان سنائی ——— اس پر کہنے لگے، ایک ٹوپی کا نوٹس لگا ہے "وایا ٹک شاپ" ——— اگر جان چھڑانی ہو تو چلو ——— یہ کیا مصیبت ہے! کسی کی چیز گم ہو جائے تب "وایا ٹک شاپ" "کسی کی چیز اٹھا لیں تب" "وایا ٹک شاپ" ——— کیا ایسا کرنے والے گھر سے چائے پی کر نہیں آتے؟ ——— کوہستانی نے جھلا کر کہا ——— اس پر کہنے لگے ؎

"اک نئی ریت چلی ہے یارو"

——— کوہستانی تو کہتا ہے یہ ریت نہیں ریت ہے ——— چلی نہیں چلی ہے جو ان کی تہذیب کو کھٹک رہی ہے اور وقار کو میلا کر رہی ہے ——— گو انہیں کے سر پڑ رہی ہے مگر انہیں ہلکا کر رہی ہے ——— یہ مہذب بھکاری ہیں ——— یہ انوکھے بھکاری ——— [illegible] دونوں گویا ہوئے کہ خوش ہو ہمارا راج! آپ اسی طرح لٹیں گے، اب آگے کا فالودہ کھاتے دانت تو ٹوٹیں گے آپ کے ——— [illegible]

فوراً زبان دے دی ——— ٹک شاپ کو چلے تو کبھی دیکھی تیجی بھی ہمرکاب ہو گئے اور ہم کباب ہوتے۔ یاروں نے جانے کیا پی پیٹ کی آگ بجھائی ——— ٹک شاپ کیا تھے ٹک کر بیٹھ گئے ——— ہماری پتلی حالت دیکھ کر ایک کامریڈ گویا ہوئے ——— "آپ کیوں پھولی سونگھنے پر اکتفا کر رہے ہیں؟" اور اُدھر ہماری حالت تھی کہ پلٹ کر پھیرا تے پھیرانے پلے کچھ نہ رہا ——— اور اس "دادا" نے سب کچھ کھایا" ———

کوہستانی کے مشورے پہ کان دھریئے، بلکہ آنچل میں باندھ لیجیے اور ان مہذب اور انوکھے بھکاریوں کے خلاف "ریزولیوشن" پاس کیجیے ——— ؎

"پھر نہیں آئیں گے ہم اس طرح جانے کو ہیں"

* * *

"مُوڈ"

ٹینی سن کی نظم "مُوڈ" (Mood) پڑھ کر باہر نکلے تھے کہ ایک صاحب کہنے لگے "یار! موڈ (Mood) خراب ہوگیا" اور آپ نے کچھ اس انداز سے کہا کہ کوہستانی سمجھا شاید اس ریل پیل میں ان کا "بُوٹ" خراب ہوگیا ہے پھر سمجھا شاید اپنے "شوٹ" کے متعلق کہا ہو ——— مگر جب مجھے حیران و ششدر دیکھا تو کہنے لگے "موڈ ——— موڈ" ——— کوہستانی اسے کوئی بیماری سمجھ کر چپ ہو رہا ——— آخر اس لیے تعلیمی دور میں کئی اور لڑکوں نے بھی "موڈ ——— موڈ" استعمال کیا، کوہستانی حیران تھا کہ عجیب اتفاق ہے کہ اس مرض کے تمام مریض اسی کالج میں آگئے ہیں ——— مگر بعد میں اس بیماری کا راز کھلا اور تعجب تو یہ ہے کہ اس کے راز کھلنے تک اسے وبائی صورت میں پایا ——— اس طرح اس حمام میں سب ننگے ہو گئے ———

اس مہلک مرض "موڈ" کی تباہ کاریوں سے کون واقف نہیں ——— اسی "موڈ" نے بہتوں کو کالج سے "موڑا" - اور اگر کوئی کالج میں پہنچ ہی گیا تو کلاسوں سے "موڑا" اور لان میں لاکر چھوڑا ——— جب تک موڈ خراب رہا پڑھائی وہیں پڑی کی پڑی رہی اور پڑھائی دھری کی دھری ———

"موڈ خراب" ہو تو پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور کلاس میں قیلولہ ہو نہیں سکتا - اس لیے صمٌ بکمٌ بیٹھنے کی بجائے ان "موڈیوں" کا گروہ مٹرگشت کرتا ہے - نوٹس بورڈ کے گرد منڈلاتا ہے اور برآمدوں کا طواف کرتا ہے ——— حیرانگی کی بات تو یہ ہے کہ دھروں کے آگے پیچھے پھر کر "پروکسی" ایسی لگواتے ہیں کہ بیچارے اساتذہ کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوتا ——— یہ "موڈی" نقد دم نہیں رہتے بلکہ ہر دم کوئی نہ کوئی ساتھ ہوتا ہے اور اگر کوئی ان کے حال پر ترس کھا کر کہہ دے کہ میاں! لوگ تن من مار کر جنگلوں میں جا بیٹھتے ہیں اور تم "موڈ" کو مار کر کلاس میں نہیں جا سکتے! تو جواب ملتا ہے "شوشہ نہ چھوڑیے" اور چاند پر خاک اڑانے کی کوشش نہ کیجیے ——— سچ ہے ——— "جونک پتھر میں نہیں لگتی" ——— اب تو بات بنا جاتے ہیں اور تکڑا سا جواب دیتے ہیں مگر وقت آنے پر دانت تلے انگلی دبالیتے ہیں - اور زبان "تالو سے لگاتے ہیں ——— وہ دن ہوا ہوئے جب ہر بات کی قدر ہوتی تھی، اب تو آنکھیں ہی بدل گئیں ——— باتوں پر کان دھرنے کی بجائے کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں ———

بات سچی ہے کو بُری لگتی

وقت بے وقت "موڈ" آف "ہونے کی آفت سر سے "آف" کیجئے کیونکہ یہی "موڈ" سبز باغ دکھا کر مقاصد سے دُور لے جاتا ہے۔ جس کی پیروی باغِ عدن میں نہیں پہنچاتی، بلکہ اس باغ میں جہاں ناکامیوں، نا امیدیوں اور مایوسیوں کے پھول کھلتے ہیں اور ارمانوں کی لاش دفن کی جاتی ہے۔

کوہستانی سو کی ایک بات کہتا ہے اسے شربت کے سے گھونٹ سمجھ کر پی لیجئے ؎

"ہے مرا نقشِ قدم چشم نمائی کرنا"

●

● یونین

یونین کے الیکشن اور "تاجپوشی" کے بعد سب سے بڑی تقریب سالانہ مباحثات ہی ہوتے ہیں —— کوہستانی ان تینوں تقاریب کو منگنی، نکاح اور شادی سے تعبیر کرتا ہے —— منگنی اور نکاح کا حال آپ پڑھ چکے ہیں اب شادی کا حال سُنیئے ——

شادی تو "خانہ آبادی" ہوتی ہے، مگر یونین کی شادی "خانہ سردی" ہے —— مطلب تو آپ کی عقلِ سلیم سمجھ ہی گئی ہو گی کہ شادی میں تو "خانہ آباد" ہوتا ہے اور سرگرمی سے گھر کے کام کاج سنبھال لئے جاتے ہیں مگر یونین کی شادی نرالا پن رکھتی ہے —— ہر سال یونین کو نئی شادی کرانی پڑتی ہے —— اور یہاں "شادی" کو ہال میں کرسیاں آراستہ و پیراستہ ——

پچھلے سال کی طرح امسال بھی شادی کی تیاریاں بہت پہلے سے ہی دھوم دھام سے شروع کر دی گئیں اور مختلف کالجوں سے "جوڑے" منگوائے گئے اور دعوت نامے بھیج گئے —— بالآخر ۲۸ فروری آن پہنچی اور ساری "آن" دیکھ کر سب میں "جان" آئی —— یونین کے ہر رکن کو نیا اور قیمتی لباس پہنایا گیا اور جھلمل جھلمل کرتی سُرخ و زرد قبا میں زیب تن کی گئیں —— دودھ سے شفاف ہال کی سجاوٹ مغلیہ شہنشاہوں کے "دیوانِ خاص" کی ایک جھلک معلوم دیتی تھی —— قیمتی قالین، قرینہ دار کرسیاں، بجلی کے قمقمے اور آرائشی "شیڈ"، خوش رنگ گلدستے اور خوشنما گملے قابلِ دید منظر پیش کر رہے تھے ——

حاضرین عالمِ اشتیاق میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے —— آخر مشتاق نظروں کو انتظار کی سزا دینے کے بعد نعیم طاہر صاحب اپنی کابینہ سمیت جلوہ افروز ہوئے اور عقیدت و ارادت کے جذبات آمیز ماحول اور تحسین و آفرین کے فلک شگاف نعروں میں مسندِ صدارت کو زینت بخشی اور پروگرام شروع کیا۔

پہلا دن انگریزی کے لئے وقف رہا اور دوسرا اُردو کے لئے —— انگریزی کا معیار اُردو سے کہیں زیادہ رہا —— جیسے تیسے سب نے یونین کی دلہن کو "یادِ ماضی" کی ڈولی میں بٹھا دیا جسے وقت کے برق رفتار کہار اپنے کندھوں پر اُٹھائے دُور —— بہت دُور لے گئے —— ؎

"کیسے کہوں ایوان کا عنوان بدل گیا"

○

نگاہِ کامیاب کا بھی اعتبار اُٹھ گیا
ملیں تجھے جمال کو نزاکتیں نئی نئی
(فراق)

ارشد تونسوی
تھڑایہ

غزل

بادۂ و سازِ تو ہے گو ساقیٔ محفل نہیں
ہو نہ گر ساقی تو پھر محفل سے کچھ حاصل نہیں

جانے کیسی دُھن میں ہر دم مائلِ پرواز ہوں
اک خیالِ خام ہے جادہ نہیں منزل نہیں

التفاتِ یار میں حائل ہے میری بے بسی
ورنہ میرے حال سے وہ اس قدر غافل نہیں

مثلِ پروانہ فقط ہے جان کی بازی ندیم
اُس بہارِ حُسن کا دیدار کچھ مشکل نہیں

عاشقِ جانباز کی حالت پہ رحم آتا نہیں
اے بُتِ کافر ترے پہلو میں شاید دل نہیں

عقل کی دانست میں ہر ذرّہ ہے سنگِ گراں
راہوارِ عشق کے رستہ میں کچھ حائل نہیں

خلیل رامپوری

اک شعلۂ خیال ہے اِک مشعلِ نگاہ
کیا فکرِ آدمی بھی تراشے ہے مہر و ماہ

ہم سے ہے بستیوں کی فضاؤں میں روشنی
ہم لوگ خاک پہ بھی ضو والے ہیں برنگِ ماہ

اب اہتمامِ شیشہ و مے چھوڑ دیجیے
اب بزم چاہتی ہے چلے ساغرِ نگاہ

اب آرزوئے حسنِ گل و یاسمن کسے
بڑھا رہے ہیں لوگ ستاروں سے رسم و راہ

بیٹھے ہیں ہم بھی درد کی دولت لئے خلیل
خالی رہی ہے گوہرِ شبنم سے کب نگاہ

لطف الرحمٰن محمود

غزل

ایک صورت جو اجنبی سی ہے
اس کی خاطر یہ بے کلی سی ہے

جب سے نظروں میں ہے وہ رشکِ چمن
زندگی میں شگفتگی سی ہے !

کیا ہی پُرفن ہے حُسنِ جاناں بھی
کہ جفا میں بھی دل کشی سی ہے

طائرِ دل میں قوّتِ پرواز !!
اب کہاں اب تو بے بسی سی ہے

دشمنوں کو تو پیار ہے مجھ سے
دوستوں ہی کو دشمنی سی ہے

کس نے رسوا کیا ہمیں — تُو نے !
ہم کو اس پر بھی اِک خوشی سی ہے

شکوہ سمجھو کہ التجا سمجھو !
چشمِ مشتاق میں نمی سی ہے

آج پھر بے قرار ہے محمود
آج پھر درد میں کمی سی ہے !

از پروفیسر محمد شریف خالد ایم۔ اے

قیدی

مَیں آزاد ہوں پا بجولاں نہیں ہوں
مَیں انسان ہوں، گرچہ سلطاں نہیں ہوں
دبے گا نہ جوشِ جنوں میرا ہرگز
مَیں پابندِ دنیائے دوناں نہیں ہوں
غلاموں کی جنّت، جہنّم سے بدتر
غلامی کی عزّت کا خواہاں نہیں ہوں
حیاتِ اسد ہو تو ہے زندگانی
حیاتِ شغالی پہ نازاں نہیں ہوں
یہ اپنوں کا ہی مجھ پہ دستِ کرم ہے
عدو کے ستم سے تو نالاں نہیں ہوں
حوادث کو آواز دو اور آئیں،
ابھی ہنس رہا ہوں ہراساں نہیں ہوں
قفس میں بھی اک گونہ راحت ہے خالد
پریشاں بھی پہ پشیماں نہیں ہوں

پروفیسر نصیر احمد خان ایم۔ ایس سی

غزل

تمہاری فرقت میں حشر لاکھوں ہمارے دل ہی اُٹھا کریں گے
جگر بھی خوں ہو گا آنکھ سے بھی ہماری دریا بہا کریں گے
تری محبّت کی بات بڑھ کر اگرچہ دار و رسن کو پہنچے
جو عہد ہم کر چکے ہیں تجھ سے وہ عہدِ الفت وفا کریں گے
ملے نہ کوئی بھی ہم کو محرم مگر نہ مایوس ہوں گے ہرگز
تلاشِ تسکینِ دل کی خاطر ہر ایک در پر صدا کریں گے
کرو نہ تکلیف چارہ سازو مجھے گوارا ہے رنجِ الفت
جنہیں سلیقہ نہیں وفا کا وہ میرے دُکھ کی دوا کریں گے
نہ ڈھونڈنے سے بھی جب ملے گی کرن کہیں روشنی کی ہم کو
تو اپنے دل میں ترے تصور سے ہم اُجالا کیا کریں گے
وہی خلش ہے وہی تپش ہے وہی ہے جب روگ اُنکے دل کا
تو لوگ کاہے کو اپنے دُکھ کا تمہیں مسیحا کہا کریں گے
بنے گی جب فرشِ راہ تمہارا ہماری تربت کی خاک یارو
تو پیشوائی کو شوق سے ہم غبار بن کر اُٹھا کریں گے
نصیر محفل میں اُن کی مانا گزر ہمارا کبھی نہ ہو گا
ہماری اُلفت کے تذکرے تو وہاں ہمیشہ رہا کریں گے

امام الکلام

کس قدر ظاہر ہے نور اس مبدء الانوار کا
بن رہا ہے سارا عالم آئینہ ابصار کا

چاند کو کل دیکھ کر میں سخت بے کل ہو گیا
کیونکہ کچھ کچھ تھا نشاں اس میں جمالِ یار کا

اس بہارِ حسن کا دل میں ہمارے جوش ہے
مت کرو کچھ ذکر ہم سے ترک یا تاتار کا

ہے عجب جلوہ تری قدرت کا پیارے ہر طرف
جس طرف دیکھیں وہی رہ ہے ترے دیدار کا

چشمۂ خورشید میں موجیں تری مشہود ہیں
ہر ستارے میں تماشہ ہے تری چمکار کا

تو نے خود روحوں پہ اپنے ہاتھ سے چھڑکا نمک
اس سے ہے شورِ محبت عاشقانِ زار کا

خوبرویوں میں ملاحت ہے ترے اس حسن کا
ہر گل و گلشن میں ہے رنگ اس ترے گلزار کا

چشمِ مستِ ہر حسیں ہر دم دکھاتی ہے تجھے
ہاتھ ہے تیری طرف ہر گیسوئے خمدار کا

ہیں تری پیاری نگاہیں دلبرا اِک تیغِ تیز
جس سے کٹ جاتا ہے جھگڑا سب غمِ اغیار کا

تیرے ملنے کے لئے ہم مل گئے ہیں خاک میں
تا مگر درماں ہو کچھ اس ہجر کے آزار کا

شور کیسا ہے ترے کوچہ میں لے جلدی خبر
خوں نہ ہو جائے کسی دیوانہ مجنوں وار کا

(درثمین)

کلامُ الامام ایّدہُ اللہ

آدم سے لے کر آج تک پیچھا ترا چھوڑا نہیں — شیطان ساتھی ہے ترا لیکن وہ ہے بئس القریں

گو بارہا دیکھا انہیں لیکن وہ لذت اور تھی — دل سے کوئی پوچھے ذرا لطفِ نگاہِ اوّلیں

اُن سے اسے نسبت ہی کیا وہ نُور ہیں یہ نار ہے — گر وہ ملائے تو ملیں اُن کے قدم میری جبیں

سو بار توبہ توڑ کر جھکتی نہیں میری نظر — جُھکتی ہے ناکردہ گُنہ ان کی نگاہِ شرمگیں

آنے کو وہ تیار تھے مَیں خود ہی کچھ شرما گیا — اُن کو بٹھاؤں مَیں کہاں دل میں صفائی تک نہیں

ابدال کیا۔ اقطاب کیا۔ جبریل کیا۔ میکال کیا — جب تُو خدا کا ہو گیا سب ہو گئے زیرِ نگیں

اس پہ ہوئے ظاہر محمد مصطفٰے حُبّ الورٰی — بالا ہے تُو افلاک سے کر دو یہ اب میری زمیں

کھولا ہے کس تدبیر سے بابِ لقائے دلرُبا — آتے ہیں کس انداز سے اوڑھے رِدا المرسلیں

آ دوست دامن تھام لیں ہم مصطفٰے کا زور سے

ہے اِک یہی بچنے کی رہ ہے اک یہی حَبل المتیں

شیخ روشن دین تنویر

○

باہوش! اے دیوانو فرزانے آرہے ہیں
ہوش و خرد سے ہو کر بیگانے آرہے ہیں
یا بیٹھیے نہ بن کر محفل میں شمعِ محفل
یا کیجیے نہ شکوہ پروانے آرہے ہیں
یہ کیا رہِ حرم میں یارب قدم قدم پر
میخانے آرہے ہیں بتخانے آرہے ہیں
کیا ساقیا نہیں یہ توہین مے کشی کی
ہم خم کشوں کی خاطر پیمانے آرہے ہیں
ماضی کے جو ورق پر لکھے تھے ہم نے تم نے
یاد آج جانے کیوں وہ افسانے آرہے ہیں

شیخ اور میکدہ اے تنویر بچ کے رہنا
بہکانے آرہے ہیں بہکانے آرہے ہیں

شیخ روشن دین تنویر

باہوش! اے دیوانو فرزانے آ رہے ہیں
ہوش و خرد سے ہو کر بیگانے آ رہے ہیں
یا بیٹھیے نہ بن کر محفل میں شمعِ محفل
یا کیجئے نہ شکوہ پروانے آ رہے ہیں
یہ کیا رہِ حرم میں یارب قدم قدم پر
میخانے آ رہے ہیں بتخانے آ رہے ہیں
کیا ساقیا نہیں یہ توہینِ مے کشی کی
ہم خم کشوں کی خاطر پیمانے آ رہے ہیں
ماضی کے جو ورق پر لکھے تھے ہم نے تم نے
یاد آج جانے کیوں وہ افسانے آ رہے ہیں
شیخ اور میکدہ اے تنویر بچ کے رہنا
بہکانے آ رہے ہیں بہکانے آ رہے ہیں

قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل

نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر!

تو لامکاں میں اپنا مکاں پیدا کر
نئی زمین نیا آسماں پیدا کر

خدا نے تجھ کو حقیقت شناس دل بخشا
تو جان دے کے نئی اپنی جاں پیدا کر

زمیں پہ تنگ زمانے کی گردشوں سے نہ ہو
تو اپنے واسطے اور آسماں پیدا کر

خطا نہ ہو جو نشانے پہ ٹھیک جا بیٹھے
دعا کے تیر کی ایسی کماں پیدا کر

جھکے نہ سر ترا فسق و فجور کے آگے
جو مومنوں کی ہو شایاں و شان پیدا کر

جو لفظ منہ سے ترے نکلے دل میں گڑ جائے
خلوص و صدق سے ایسی زباں پیدا کر

بہت بلند ہے قصرِ رفیعِ دوست اگر
نہ ہار حوصلہ اک نردباں پیدا کر

شریکِ بادہ و ساغر نہ ہو سکا اکمل
نگاہِ یار میں جچنے کی شان پیدا کر

ALMANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE

MAGAZINE

March - 1961

بسم الله الرحمن الرحيم
نحمده ونصلي على رسوله الكريم

AL-MANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE
RABWAH

★

March 1961

★

Editors
Sayed Ilyas Bashir
Maudood Ahmad Khan
Jaafar Msolomi

Contents

		Page
Editorial	Ilyas Bashir Ahmad ...	2
Electron Microscope	Ayaz Ahmad Ayaz ...	3
The Why of the Congo	Mahmud S. Conteh ...	7
On Adversity	Ijazul Haq Qureshi ...	11
Psycho—Therapy	Ehtasham Nabi, IV Year ...	13
Request	Lutfur Rehman Mahmood ...	16
Science in the Service of Mankind	Muhammad Rashid Zafar ...	17
Some Aspects of Physical Education	M. A. Anwar, B.A., D.P.E. ...	19
My Samry	Zia Piddi, II Year ...	22
The Lion Business	Jaafar Msolomi, II Year ...	24

Printed at the Lion Press, Hospital Road, Lahore.

AL-MANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE MAGAZINE

VOL. NO. X | MARCH 1961 | NO. 1

WE often hear our teachers saying, "Don't put off till tomorrow what you can do today." But very few of us are able to act upon this advice. Some of us try very earnestly to act upon this dictum but by the passage of time our determination is shattered to pieces.

In our day-to-day life we come across so many problems, which, if neglected, cause great trouble. But in spite of the fact that we are aware of the serious consequences, we fall a prey to the incurable disease of lassitude. This lassitude, in fact, is a moral weakness.

A thing postponed for tomorrow is never accomplished as that "tomorrow" never comes. The way leading to "tomorrow" leads to destruction. Success in life depends upon our hard work of today. Even our "tomorrow" is the creation of today.

When a man is determined to do some work the work is sure to be done, as when force is applied to a machine it starts moving. The first and the foremost thing is to do our work with an unshaken firmness. The start may be difficult but if 'today' is taken into consideration and hard work done, favourable results will be seen tomorrow and our continuous labour will draw our success nearer and nearer

Life is not a bed of roses. It has its own problems and if we want to lead a happy and contented life we will have to face its problems fearlessly and steadily. To decide is our own job, but there is no harm in taking advantage of the advice of other people, who have greater experience in the vast field of life, without totally depending upon them.

So, under the light of the above mentioned words we should make a resolution that we won't postpone anything till tomorrow and that to day shall see us doing so many deeds for the benefit of our nation and for our own good. The magic lamp of Ala Din does not exist today and a great achievement requires perseverance and steady work.

The first step leading to an achievement is Desire. At this step we build castles in the air and this is the step where most of us cannot stand the high impact of the flooding desires that haunt our mind. At this stage our desire for a great achievement, mixed with other common desires, looses its individuality and even existence.

The second step in this context is 'planning'. There are only a few of us who give real form to their castles in the air. Most of us spend the whole of our lives in thinking and never proceed to action. This is due to the fact that we don't have any sense of planning.

The real procedure is that we should first create the desire in our hearts, then we should plan for its accomplishment and, having done all this, we should at once move to action.

ILYAS BASHIR AHMAD

ELECTRON MICROSCOPE

by

AYAZ AHMAD AYAZ

TO appreciate fully the instrument, it is necessary to trace out stages of evolution in the technique of magnifying instruments. The natural magnifying glass given us is the eye and its power of perception is limited to only ·02 cm. Objects smaller than ·02 cm. are not visible to the human eye. To overcome this weakness man began to struggle, until he came to use simple magnifying glasses and then a compound microscope, which is nothing but a combination of two such glasses placed at an appropriate distance. Then came the turn of the ultra-microscope. In this particular microscope a beam of light is concentrated upon the object to be viewed and scattered light rays are detected by a powerful compound microscope placed at right angles to the beam of light. Up till this stage, the smallest particle which turned out to be a visible one was of the order of ·00002 cms. The theoretical amplification possible by an ultra-microscope is 3000 but practically attainable value is only 1000. The fact is that further amplification causes achrometism and blurring of the object takes place. Even when achromatically free glasses were employed it was found that further details of the object were not possible and further amplification simply increased their size. This limit was afterwards found due to the light used to illuminate the object. The wavelength of the ordinary light is 6×10^{-5} cms. and the particles smaller than the wavelength of light waves jump upon the particles smaller than their wavelength. Attempts were next made to improve it by using ultra-violet light which has a wavelength shorter than the ordinary light, but were of no great success.

Then came the idea of substituting a beam of electrons for a beam of light. But before this idea came to the scientists, there were certain properties of the electron to be discovered and recognised. In connection with our topic two properties are worth mentioning.

First, particles such as electrons have a wave nature similar to light rays, but of much shorter wavelength. It was forwarded by Louis de Broglie in 1923 on theoretical grounds.

Secondly, the possibility of focussing electrons by electric or magnetic lenses.

It was in 1930 that these properties were fully tested and recognised. In 1932 with much patience and skill the first instrument of its kind was constructed, in which glass lenses were replaced by electrostatic lenses, beam of light by a beam of electrons and brass tubes which held the lenses with a long evacuated glass tube with electrostatic lenses and screens for direct viewing of the object housed in it.

With perfected technique the electron microscope at present gives an actual magnification of 20,000 with an upper limit of 1,00,000. For useful magnification two conditions must be satisfied :

First, high resolution into detail ; and

Secondly, perceptibility of resolving details. Hence the higher the resolving power with a high perceptibility the greater will be the magnifying power of the instrument. If perceptibility decreases with increase in resolution, the final image would get correspondingly blurred and hence no useful purpose is served. That is what sets the low upper limit to the magnifying power of an optical microscope.

In electron microscope the resolving power can be greatly increased without detriment to perceptibility of detail. Resolving power depends upon two things, wavelength of the light used and the numerical aperture. The smaller the wavelength of light used, the greater will be the resolving power, but on the other hand it is directly proportional to the adumerical aperture.

Now according to wave nature of the electrons when they are scattered or diffracted they behave as light waves. The wavelength can be determined by the de Boglic wavelength formula which is

$\lambda = h/mv$ where λ = wavelength
h = Planks constant, $(6{\cdot}5 \times 10^{-27})$
m = Mass of an electron $(9 \times 10^{-28}$gm$)$
v = velocity of the electron, which can be determined.

When electrons are accelerated with a P. P. of 60 KV, velocity of the electrons can be calculated by the formula $\frac{1}{2} mv^2 = eV$ where V is the anode voltage, 'e' is the electron charge and "m" mass of the electron. Knowing, E, V and M, V is determined and by applying de Broglie wavelength formula, wavelength is calculated which is found to be 5×10^{-10} cm. which is nearly 10^{-5} times smaller than that of ordinary light. Thus the resolving power should be 10^5 times greater of the Electron microscope theoretically, but is lowered due to some limitations in numerical aperture. Anyhow the satisfactory resolution obtainable is very high.

As far as perceptibility is concerned, it is secured even under high resolution by a special focusing scheme of electrons. The greater the number of electrons or concentration that strikes the minute object, the greater will be the number of electrons scattered from the object which will render every detail of the object more clearly perceptible. Just as in optical microscope, a beam of light is concentrated on the object, and the intenser the beam of light is, the more clearly the object is visible, here in electron microscope, the beam of light is replaced by the beam of fast moving electrons, sharply focussed on the object of electrostatic or magnetic focusing. In electrostatic focusing, the principle applied is the same as in cathode ray tube, the whole combination known as "electron gun". The first practical electrostatic lens system which lent itself to the construction of an electrostatic electron microscope was given by Buuch & Johnson in 1932. It is called the three electrode lens. But there were some difficulties found in the use of electrostatic lenses and constant working conditions were not obtainable satisfactorily. Thus modern lenses are based upon magnetic effects of currents.

In this particular focusing a very strong mag. field H is placed in the path of the electron beam, and electrons are focused at a point depending upon the field applied. The coils used are of special type and stray magnetic fields are avoided. The geometrical construction of coils helps in getting magnetic fields of high intensity at a cost of comparably low currents. These microscopes are of two types.

(1) Emission type, and

(2) Transmission type.

In emission type only the magnified image of cathode surface is visible and any object placed on cathode is magnified in length and breadth only. In transmission type the object is placed in between cathode and first magnetic objective. The slide used for the purpose is made of collodion about 10 milli microns thick.

The optical microscope is focused by motion of lenses so as to obtain a sharp image of the object. But in magnetic electron microscope it is carried out by controlling current flow in the magnetic focusing coil and thus varying the 'f' of the magnetic lens. But as regards size, appearance and cost, it weighs some tons, standing 8 to 9 ft. high with a number of eye-pieces at convenient heights and costing Rs. 100,000.

The image is either directly photographed or the electrons are allowed to be focused on a fluorescent screen, and scintillations make the image visible for direct viewing, as in cathode ray tube or in television tubes. Due to certain physical limitations which the present state of technique has not completely solved, the instrument is capable only of seeing directly particles about 20 times smaller than those visible in the very best optical microscopes. The magnification can be enhanced 100 times with photographic enlarging methods. The electron microscopes by using several stages in electron lenses can have magnifying powers of 1 million.

As we know that resolving power depends upon the wavelength of light or particles employed, the smaller the wavelength the greater the resolving power. Considering the de Broglie wavelength formula

$$\lambda = h/mv$$

Wavelength is inversely proportional to the velocity of particles and mass of the particles. Now if we use protons (instead of electrons) which are bare hydrogen nucluei and 2000 times greater in mass than electrons the resolution can be increased to 2000 times by simply replacing the particles employed. But as usually happens the greater magnifications have to be paid for by the loss of some other advantage. In this case power of penetration of protons is so low that transmission type microscope is not possible. *Thus protons are focussed on the object at a grazing angle and reflections are amplified. So now we require a particle having high penetrating power, which can be focused at a point and capable of high velocity.

---

*The latest amplification got by an ion microscope or proton microscope is 2.75 million times. The scientist who declared this amplification also declared that he was able to photograph an atom as a mere point.

THE WHY OF THE CONGO

by

MAHMUD S. CONTEH

The slavery to which Africans have been subjected is unprecedented in the history of the world. The economic exploitation, the social degradation, the systematic and methodical attempt to exterminate the Africans have been ruthlessly carried out. Nowhere else are racial feelings so high as in Africa. The attempt to reduce the Africans to "hewen of wood and drawers of water" has produced a tension which is dragging mankind to extremism and another worldwide holocaust.

The nineteenth century saw the scramble for Africa, the massacre of Africans, the destruction of African culture and civilisation, the contemptuous treatment of everything African. The annihilation of the African political strucure and African culture was not satisfactory to the Europeans who brought with them the "Sacred Cross" as the hallmark of civilisation.

The devastating effects were most marked in the Republic of Congo. In less than two decades, no less than 10 million African Congolese were killed in cold blood by the civilised Belgians, the upholders of the Christian faith. This huge land mass (with an area of 905,400 sq. miles) the largest African state was, unlike most colonial territories, the personal property of Leopold II. The African in the Congo was subjected to the most inhuman treatment. He was a slave in his own house. His movements were not only watched but also restricted.

The White Man in the Congo was the supreme authority. He could punish and even shoot a Congolese. A Congolese father could be flogged in the presence of his famiy by any European who wished it. Segregation, like in the Union of South Africa, was complete. Surely, the eighty years of Belgian rule in the Congo was a period of torture and suppression, a period torpedoing the human values without which man is crude and brutish. Certainly the Belgian rule is a symbol of African indignity and degredation. It is unprecedented in African history.

For eighty years, the Belgians had been in the Congo. And for eighty years they produced only 17 Congolese graduates—no doctor, no engineer, not a single lawyer. There were no colleges for higher education in the country. The few schools in the country were in the hands of white missionaries who taught their students that nationalism was devilish and who also saw that the students, before graduation, were converted to Christianity.

To understand the present conflict and confusion in the Republic, certain statistics are necessary. The interests that are engaged in the Congo are empires in themselves, those in Katanga have fabulous advantages which they abhor to relinquish.

Among these is the ramified 'Society General de-Belgique' whose pyramidal structure covers the 'Comite Speciale du Katanga.' This single concern holds property of the size of 111,111,111 square acres. The next concern is the 'Compagnie du Hant Katanga' which is connected with the 'Union Miniere du Hant Katanga'. The Union holds a concession of 7,700 square miles, *i.e.*, half the size of Belgium itself. This concession was not to end till March 11, 1990. The independence which came to the people of the Congo this year, these interests feared, would deprive them of their "right to exploit the wealth of this sprawling region for their share holders and the Belgian Government which holds two—thirds of the shares in the 'Commite Special du Katanga,' the organisation owning 25% of the Union Miniere.

This fact can be better appreciated when we know that the Union Miniere produces from Katanga 7% of the total world production of Copper, 80% of Cobalt, 5% of Zinc as well as large quantities of Silver, Tungsten, Cadmium and Platinum. The Uranium mines at Shinkolokwe, the source of nuclear material for nuclear weapon nations, are also operated by this company. The amount of this production is a closely guarded secret, as also the price paid for it.

Katanga

It is now easy to understand the efforts being made by the imperialists, represented by Belgium, to separate Katanga from the Republic of Congo. With the strongly Congolese National Movement (headed) by the patriotic Mr. Lumumba), this can only be done through puppets who are always willing to be tools of the imperialists. Thus we have the apparent willingness of Belgium to leave the Congo being conteracted by the threat of cessation by Mr. Tshombe, the Chairman of the Provincial Council of Katanga, a province of the independent Republic of the Congo, and, of course, through him the Union Miniere and the Belgians defy the U.N. troops from entering Katanga.

The British Press lends support to the fact that the Union Miniere controls the Provincial Council of Katanga, in fact, it is one and the same. Thus *The time* of London of 12th July said: "The city (Elizabethville) is now, however, entirely controlled by the Belgian army. Much in Katanga depends on what the Union Miniere, which supports Mr. Tshombe, the Premier, now decides to do".

Why the Mutiny

The Belgians in the Congo had followed a policy of systematic elimination of the Congolese from the Congo's political life, it was a policy aimed at political castration in the hope that the Africans would be unable to fight and win freedom. But, alas ! freedom is a birthright.

But the political frustration created by the Belgian overlords created a situation in which it was impossible to continue Belgian administration, while at the same time no Congolese had been trained to run the administration of the fatherland. The struggle for independence in the Congo is the shortest in modern times and the Belgians were so overtaken that they pulled out, but fully expected to return in another form. The high positions in the army, the police and the public services were the exclusive reserve of the Belgians. No Congolese could hope to rise to any high rank in the army. The Force Publique had been subjected to the harshest discipline and the pay was very low. Under these circumstances, it was not possible to build up an indigenous cadre to man the services. And this situation became more ludicrous when an African became a defence minister.

The discontent, hatred and suspicion which this situation created might have been averted if the Belgian officers were realistic enough and tried to alleviate the condition of the soldiers.

But the Belgian commanders aggravated it. They emphatically stated that though the Congo was now independent yet conditions had not changed, things would remain as they were in the pre-independence days, *i.e.*, independence was a sham and mockery; that the Belgian was still the master. This and only this is the cause of the mutiny by the Force Publique, the National Army of the Congo. This is the root cause of the confusion, disorder and choas in the Congo.

When the mutiny occurred the President and Mr. Lumumba went to the port of Matidi and asked the Belgians not to leave the country. But under the instructions of the Belgian Council, the two National leaders were arrested and put on board a ship. Simultaneously, the town was raided from the air and machine-gunned by Belgian Military aircraft and shelled from the sea. And though there were no Belgian civilians to protect, the Belgian troops entered the town, shot in cold blood the policemen on guard, and even some civilians. This led to organised violence by members of the Force Publique—which also lead to Belgian intervention in the affairs of a free sovereign state.

It was at this juncture that Belgian troops entered Katanga and buttressed Mr. Tshombe to declare Katanga an independent state. The administration, the army, the police, etc., were all in the hands of these Belgians. Katanga itself was supported and openly maintained by the Belgian troops. Here was a situation of extreme danger.

And it was this dangerous situation that forced the Prime Minister, Mr. Lumumba, to call for aid from the United Nations.

The Congo and the U.N.

History and the progeny of mankind will judge the United Nations by its action in the Congo.

The United Nations is not bound to go to the call of any country for help. But once it has decided to go and assist that country, then logic demands that it owes an obligation to the government and the people of that country not to interfere in such a way as to hinder the smooth working of the legitimate Government that invited it. My proposition here is : it is impossible for the United Nations to simultaneously preserve law and order and be neutral between the legal government and the law-breakers. Unfortunately, this is what has happened in the Congo and is the main cause of the present difficulties and disagreements in the Congo.

It is this that led to the ludicrous and embarrassing events in Leapoldville. The U.N. troops were sent to the Congo to preserve the legitimate government of Mr. Lumumba, the man that called for U.N. assistance. But it is the very U.N. toops that prevented Mr. Lumumba from carrying out his functions as Premier, *i.e.*, using the Radio Station for announcing government policy.

I must repeat here the United Nations was called by the Prime Minister. He was elected leader of the Congolese Republic by the elected representatives of the Congolese people, *i.e.*, he represented the legitimate government of the Congo. Let then the U.N., to avoid bloodshed, confusion and international insanity, support this government.

ON ADVERSITY

by

IJAZUL HAQ QURESHI

There is nothing inalienable in the world. Palmy days do turn into rainy days ; he who lives in clover, sometimes gets into hot water. But blessed are those who go through fire and water, who make headway even being in a pretty mess and get over all troubles and turmoils in the long run !

The problem of adversity is a moot-point, yet it has more advantages than disadvantages. So far as its advantages are concerned, it goes without saying that adversity teaches a man how to face impediments and obstacles with tight-lipped heroism and endure hardships 'under the bludgeonings of chance.' Thus we develop the courage and fortitude which enable us to combat the critical juncture. Adversity, as a matter of fact, is a training for enduring untoward happenings. "The virtue of prosperity is temperance and the virtue of adversity is fortitude which in morals is the severe heroical virtue," says Francis Bacon.

The men of letters see eye to eye with the view that it is adversity which teaches us to make amends for our past errors and omissions. For instance, when Humanyun lost the throne of India for 15 years, he realized his faults, made up his deficiency in tactics of war and ultimately succeeded in reconquering the 'Kingdom of Hindustan.' Just as crude gold does not become brilliant unless we put it into a furnace, similarly the bright qualities remain dormant unless a man goes through the furnace of adversity. But it is an uphill task because nobody wants that he should be enmeshed in difficulties. Of a truth, "The good things which belong to prosperity are to be wished, but the good things which belong to adversity are to be admired."

Adversity is an esoteric blessing and it is a matter of history that all the greatest figures of history have sprung up from the school of adversity. Abraham Lincoln was a poor man who lived in a simple log cabin but, having the hallmark of genius, he played his cards so well that he became the President of America. The achievement represented in Abraham Lincoln's rise from poverty to fame has been repeated by many thousands of his countrymen. No less than five other American presidents were born in simple log cabins, but later on they gained enough ground to make their mark in the world. Another conspicuous example is that of Sher Shah Suri, who ruled India for five years (1540-45). Dr. Tipatthy says, "Sher Shah is one of those great men of history who blossomed out of dust into glory and rose to the highest pinnacle of distinction by dint of their courage, ability and resourcefulness. He was neither born in purple nor could he boast of his origin from any high family of religious or military leaders."

Poverty, of course, is a part of adversity, for it makes a man suffer misery and affliction. All the mealy-mouthed and fair-weather friends leave the poor in the lurch. "Adversity flatters no man," says the proverb, so when the halcyon days pass away, the people also turn away. The poor have no money in their pocket, so no wonder they are looked down upon. From this point of view pennilessness is a curse but this does not mean that adversity, on the whole, is a curse because other factors should also be taken into consideration.

Adversity has manifold advantages but, methinks, I need not split hairs over everything and clinch the arguments with the doctrine of President Garfield that 'the richest heritage a young man can be born to is poverty.' So those who are not born with a silver spoon in their mouth should not bewail poverty as an evil. It is the class from whom the good and the great will spring. It is generally from the cottage of the poor that the world receives its teachers, its martyrs, its inventors, its statesmen and its poets.

Psycho - Therapy

by

EHTASHAM NABI, IV YEAR

Mental health is a problem that concerns everyone. The million who become neurotic or psychotic need help, both to relieve their own misery and to lighten the burden they impose on others. Normal individuals need to know and practise the ways of living that are most satisfying and that guard against the development of maladjustment. Consequently there are two general aspects of the problem of promoting mental health. One is to give aid to the maladjusted ; the other is to help normal individuals improve their personal adjustments.

Here we will discuss the various methods of treating mental illness briefly.

Psychotherapy

Therapy is the general name given to methods of treating mental illness. Mental illness is often the consequence of emotional maladjustment, but it may also be due to some physical disease of the nervous system, i.e., such as syphilis or brain tumours. Different kinds of theraphy must therefore be used to treat mental illness. Some therapies aim at eradicating the underlying physical disease. Others involve surgery of the brain subjecting a patient to convulsive electric shocks or using drugs that restore him to a more normal state. Psychologists cannot handle such a case because such theraphies are strictly in the hand of medical experts. So we shall not discuss these. On the other hand, for many maladjusted individuals the appropriate theraphy is psychological and hence it is called psycho-therapy. It is used not only for those who are seriously ill with psychoses or psychoneuroses, but also for those with personally problems that are less serious. Delinquents and maladjusted children and people with marital-religious, scholastic, or occupational problems may need and benefit from psychotherapy, therefore psychotherapy may be interpreted as the treatment of the whole range of problems of adjustment, from difficulties that may be minor and only temporary to those that are serious and chronic. The person who comes to psychotherapy is faced with problems he has not been able to solve for himself. Some of his problems may lie in his environment, usually the major source of his problems is within himself. Whatever the situation be, ideally, the therapist would like the patient to get to the root of his problems and to eliminate them. To attain this object, both the therapist and the subject must work diligently together to uncover repressed motives, find the sources of anxieties and maladjustment. The process, however, may be very long and expensive. There may be also unfavourable circumstances presented to the psychotherapist, but it is necessary for him to set a goal and should decide early in the course of treatment what his goal will be, because his over all strategy, the length of the treatment, and the details of it depend on this goal. Several sources of information are used during this decision of setting a goal. One is the life history of the subject given by himself. Another is physical and psychological examinations of person including tests of intelligence, personality, and vocational abilities. Another is the picture the therapist forms of the person's problems in the course of the first few interviews.

Having gathered all the information, the therapist then sets a goal for the therapy and maps his strategy accordingly. Thus the goals which he has before him are three :

1. Changing the patient's environmental situation.

2. Enabling the patient to achieve insight and self-understanding.

3. Giving the patient emotional support.

As a matter of fact almost all psychotherapy includes some insight and eventually even more situational changes. Now let us take the specific techinques that therapists use in their efforts to uncover the deep causes of a person's difficulties.

There are varieties of techniques of psychotherapy that are used according to the theoretical background of the therapist and the severity of the patient's problem.

Early therapies were rather directive, they instructed patients in things they should do by attempting to educate them, to desensitize them in emotional situations or to suggest specific ways of behaving. Modern psychotherapy is more non-directive, it encourages the patient to work out his own problems, with the help, but little intervention from the therapist.

Directive techniques involve explanation, direction, and control of the patient's life. They are, we cannot say useless, of very small help to the patient. But therapists have come to realize that patients cannot make fundamental changes in their adjustment merely by being told to do such and such things nor by external manipulation of their environment. Rather, for psychotherapy to be of deep and lasting benefit, the patient must learn how to solve his problems.

Modern therapies have, therefore, tended to become non-directive. They establish a permissive situation in which the patient is dominant and is given the greatest possible freedom to express his attitude. There are several varieties of non-directive techniques. One is found in Freud's technique of psychoanalysis. Another is therapy devised by Rogers which is called 'client centred.' The client centred therapy is designed not to solve any particular problem of the patient but to provide an opportunity for him to develop his own improved methods of adjustment. In this method a therapist's role is to respond only to the client's feelings, ignoring the words in which he reveals them, this is also described as a therapy in which :

1. The individual, not the problems, is the focus.

2. Feeling rather than intellect is paid greater attention to.

3. The present is given the greater attention than the past.

4. Emotional growth takes place in the therapentic relationship.

This kind of therapy has been affective in the counselling of college students and in the treatment of normal people with problems of adjustment and mild neurosis. It has not been so successful with dependent people and those with extreme emotional difficulties.

Psychoanalytic therapy follows the teaching of Freud, emphasizes free association as a technique and makes use of transference of the patient's attitude to the therapist. The technique that is used by psychoanalysts consists of free association as the basic technique of therapy and the use of the phenomenon of transference to analyze the source of a patient's problems.

In addition to the methods we have discussed, psychotherapy includes a large number of special techniques.

1. Psychodrama is a special technique that permits a patient to act in different situations.

2. Play and Release therapy used principally with children, encourages the patient to exhibit his feelings in a play situation.

3. Group therapy, another special technique, permits troubled people to talk over their problems with each other under the guidance of the therapist. Success will, in part, depend upon the wisdom of the therapist. He must for the most part remain in the background, but he must know when to intervene, not only to provide necessary guidance, but also to prevent verbal attacks by one patient on another. He also needs to be particularly skilful in order not to take over the situation and kill the spontaneity of the group.

REQUEST

by

LUTFUR REHMAN MAHMOOD

Who has thrown my rose-like heart
In deep inferno of dull grief?
Wan heart is weeping in despair
Why life of hope is so brief?

Tears are hot like boiling blood,
Sighs are low like cries in caves,
Lips are mute like old dumb stones,
But thoughts are trembling like sea-waves.

Look at the face of innocent life
Which was sold for a short-lived smile;
A smile which scattered its glorious light
On darkish horizon of heart for a while.

Ah! that life which was calm and gay
Now is woven with sullen "tomorrows" !!!
And ups and downs are everywhere
Which are filled with thorns of sorrows !!!

Heavenly light is dead in bosom
And heart is burdened with regret.
In shining temple of my soul
There is a roar of terrific threat!

Silvery skiffs of delicate hopes
Have sunk in flood of misfortune!
Poor heart has played on flute of love
And life has become a mournful tune !!!

O Ye! who have gained my heart!
Do not throw it with disdain
It has paid the price of smile
Without any thought of loss or gain!

Science in the Service of Mankind

by

MUHAMMAD RASHID ZAFAR

PROFESSOR Faraday was once lecturing before a distinguished audience at the Royal Institute in London. He was showing how when a magnet was brought suddenly near a coil of wire a slight current of electricity was produced in it. "But Professor," a lady asked, "even if the effect you explained is obtained, what is the use of it?" Faraday replied, "Madam, will you please let me know the use of a new born babe?".

The lady's question sets before us the point of view of a layman. Does science help him in the affairs of everyday life? Does it increase the happiness of mankind? Has it done any service to humanity—these are the criteria by which most of us are prone to judge science.

What is the value of science in everyday life? It has made possible swift locomotion. The aeroplanes are seen buzzing over our heads. Wireless telegraphy, telephone and radio have rendered possible the transmission of messages in no time to any part of the globe. One can realize what difference the aeroplanes have made to the world if one trevels by them. You lunch in Karachi and take your dinner in London.

Science has brought safety and comfort to man. It has made known to us several cures and medicines which were unknown in days gone by. The discovery of X-rays is a great boon. Are not these the achievements and benefits of science?

Science has destroyed the barriers of time and space that formerly separated the East from the West and North from the South. Has not science made it possible by means of railways, ships and our new Comets, Viscounts and Boeing 707 aeroplanes for the people of one part of the world to send help to the other parts whose people have been afflicted by famine or earthquake or volcanic eruption?

The discoveries and inventions of science have increased the means of comfort by helping on the progress of industry and agriculture. Fields are now more scientifically cultivated than before. Machines have supplemented hand labour and are turning out the necessities of life in abundance.

Science has brought safety and comfort to every individual. The safety lamp is there to ensure the safety of the miners. Electricity is the maid of all work. It sweeps, lights and warms our houses and cooks our food.

Science has provided us with a number of healthy amusements and recreations. Radio and television have brought entertainment to our doorstep.

Though science has conferred so many blessings on humanity, yet it has brought no peace to mankind. Does the world know peace? Do people enjoy a life of ease and comfort? The aeroplanes may be buzzing about, the radio may be humming, the railways may be panting in all parts of the world, yet we know no peace. Has not science made human life unsafe and uncertain by the discoveries and inventions of Atomic Bomb, Hydrogen Bomb, poisonous gases and so many kinds of Sputniks?

The whole world groans under the destructive force of science. So it is clear that science has not brought unmixed blessings to humanity.

SOME ASPECTS OF PHYSICAL EDUCATION

by

M. A. ANWAR, B.A., D.P.E.

EDUCATION means instruction or training, and the meaning of Physical Education is education through physical activities.

Physical Education aims at educating an individual through physical activities. Modern Physical Education is quite different from that of the old "School Drill"

Physical Education includes all activities that minister to Physical Health. In addition to Colisthenics or free standing exercises, it includes activities like athletics, minor and major games and sports, gymnastics, swimming, mountaineering, hiking, etc., in short, all such pursuits which create a love of the open air and healthy living. The aim of Physical Education is to provide vigorous exercise for the body as a whole ; to develop strength, endurance, and neuro-muscular control.

So Physical Education is that phase of the whole process of education which is concerned with rigorous muscular activities for the harmonious development of the body and mind, not a particular part of the body—"A sane mind in a sound body," goes the proverb.

Physical Education develops healthy physique, alert intelligence and sound character. Physical growth is essential to intellectual growth. In the present times, with crowded localities, confined spaces and sedentary occupations, the need for physical education has grown manifold. Properly directed Physical Education programmes not only stimulate vital organs of the human body but also develop mental faculties and give qualities of alertness, decision, concentration and self-control which are so essential to success in life. Therefore, we see, it is very important to administer Physical Education from the primary classes. In this way we will be able to develop the constitution of the body in a proper way among our children. Ultimately our youth will be bodily strong, mentally intelligent and spiritually healthy.

It is said that the child is father of the man. Let us then build the child in order to build the man, once men are made the nation is made.

Sports can play a very valuable role in building the child as they are the means by which the child can give expression to his deepest instinctive tendencies. The child wants to run, to jump, to climb, to strike, to throw. Sports are the means for the satisfaction of these tendencies and in the process develop co-ordination of the mind and the body, and also train the emotions so that the child may adjust himself socially.

Mens sana in corpore sana, a sound mind resides in a sound body. Sports are the means to physical growth and health. They exercise a healthy influence upon the vital organs and systems governing circulation, respiration, nutrition and elimination, which also results in the mental development of the child. The mind becomes alert and capable of sustained effort, and through the training of the emotions the social adjustment of the child is ensured In short sports give us physical, mental and spiritual health.

What is the common man's conception of a sportsman ? He thinks that a sportsman is a person who is endowed with conditions of physical, mental and emotional fitness. The organs of his body are in sound condition and discharge their functions properly and efficiently.

The brain has perfect control over the nervous system. The heart pumps the blood at a normal rate to all parts of the body. The lungs purify the blood and other organs also do their assigned tasks normally. Then the sportsman is not only physically fit and muscularly strong but he also possesses a healthy personality and excellence of character. In other words, he has a well integrated personality.

If we can develop in our young men the proper conception of health, *i.e.*, not only physical fitness but also a sound mind which results in turn in soundness of character, we shall raise the stature of the nation, for then the nation will have individuals with correct attitudes and correct emotions. Only healthy individuals can make a healthy nation. The ancient Greeks saw the wisdom of this idea and built up a strong nation through what were called the Olympic Games ; and when their decline came through a life of luxury and self-complacence, these games not only arrested their degeneration but once again generated a process of renaissance, and gave that nation fresh vigour of character. The Roman emperors saw this and by brute force of their armed strength prohibited the games, and thus they prevented the rise of the Greeks.

To conclude, I must sum up some specific advantages of sports.

are the means by which the child can give expression to his deepest instinctive tendencies. The child wants to run, to jump, to climb, to strike, to throw. Sports are the means for the satisfaction of these tendencies and in the process develop co-ordination of the mind and the body, and also train the emotions so that the child may adjust himself socially.

Mens sana in corpore sana, a sound mind resides in a sound body. Sports are the means to physical growth and health. They exercise a healthy influence upon the vital organs and systems governing circulation, respiration, nutrition and elimination, which also results in the mental development of the child. The mind becomes alert and capable of sustained effort, and through the training of the emotions the social adjustment of the child is ensured In short sports give us physical, mental and spiritual health.

What is the common man's conception of a sportsman ? He thinks that a sportsman is a person who is endowed with conditions of physical, mental and emotional fitness. The organs of his body are in sound condition and discharge their functions properly and efficiently.

The brain has perfect control over the nervous system. The heart pumps the blood at a normal rate to all parts of the body. The lungs purify the blood and other organs also do their assigned tasks normally. Then the sportsman is not only physically fit and muscularly strong but he also possesses a healthy personality and excellence of character. In other words, he has a well integrated personality.

If we can develop in our young men the proper conception of health, *i.e.*, not only physical fitness but also a sound mind which results in turn in soundness of character, we shall raise the stature of the nation, for then the nation will have individuals with correct attitudes and correct emotions. Only healthy individuals can make a healthy nation. The ancient Greeks saw the wisdom of this idea and built up a strong nation through what were called the Olympic Games ; and when their decline came through a life of luxury and self-complacence, these games not only arrested their degeneration but once again generated a process of renaissance, and gave that nation fresh vigour of character. The Roman emperors saw this and by brute force of their armed strength prohibited the games, and thus they prevented the rise of the Greeks.

To conclude, I must sum up some specific advantages of sports.

1. Sports make all parts of player's body perform their functions properly, and thus improve his physical efficiency and stamina.

2. They improve the player's posture which is necessary for a graceful appearance.

3. They increase the player's powers of resistance to disease.

4. They create in him a healthy interest in physical activity and profitable use of leisure.

5. They inculcate in him the zest to live a clean life according to the laws of hygiene.

6. They develop in him the ability to meet physical emergencies.

7. They develop grace of bodily movement.

8. They promote in him the desire for wholesome associations and recreation.

9. They decrease mental strain and improve mental health.

10 They develop alertness of mind and quickness of response.

11 They develop courage, self-control, self-sacrifice, courtesy, kindness, loyalty, obedience, honesty, co-operation and initiative.

12. They develop the proper spirit toward victory and defeat.

13. They develop good character.

14. They develop the qualities inherent in good leadership.

The people of a nation should work on the trinity or three fold union of health in body, health in mind, and health in spirit, for we can never at any stage forget our Creator even on fields or the athletic track. Any athlete, no matter who, is really a unit of his nation and it is the cumulative effort of all athletes and sportsmen who keep in view this trinity of body, mind, and spirit, which will uplift the nation to a place of greater pride. A nation that gives sports facilities to its young boys to turn them into healthy sportsmen will have ample reward, for its people will always be prepared and ready to face all emergencies.

Sports shows all humanity for what it is. Men everywhere are the same. Their background, culture, and tradition will not help them to win, say, the hundred metres. No matter who they are, they must discipline themselves and train vigorously. Thus it is with nations. Their faces must be set forward to the tape, and the better they all run together, the better this world will be. They will not waste time hindering the other fellow, for it is unsportsman-like and retards their own progress, and in the best races the losers congratulate the winner and learn from him.

God who created me,
Nimble and light of limb,
In three elements free,
To turn, to ride, to swim.
Not when the sense is dim
But with a heart of joy.
I will remember Him.
Take the thanks of a boy !

MY SAMRY

by

ZIA FIDDI, II Year

Oh ! my dear, my darling, you are gone, gone for an unknown period, leaving me in this dreary world to live for nothing but to weep in the memory of those pleasant days I passed in your company. My dear, I always felt strength and power in your company. I actually used to become a rival to a lion in strength with you standing by me. I used to kill, I used to fight with your help, but now I am as helpless as a sheep. Now I am a coward, now I am afraid of darkness, afraid of everything, dear, because you have left me. You were everything to me, you were my companion, you were my friend, you were my lover. It was you who came to my rescue in every difficulty and strengthened me with your presence.

I very well remember when I first saw you, you were standing among some of your friends, but they were nothing before you. You had your own individuality, your own eloquence which attracted me towards you. On that very day I got acquainted with you and soon we became fast friends.

I used to be very lonely and unsocial but with your friendship I became very popular and social, you introduced me to new groups of people, to new spheres of life. With your help I came to be respected and admired amongst the intellectuals, amongst poets and amongst people of good taste. This thing built up my character, raised me above the normal in every walk of life.

I very well recall that even those people who never condescended to look at me, came to me like bees to a flower, and showed great desire to win my friendship.

I was never a brave man but when I got you I became bold and brave enough to plunge into every danger.

In studies I was not a good student, I used to be first from the bottom. Once I even left my studies and passed a few years in complete moral despondency. You came to rescue me and pulled me out of these immoral conditions and a made up my mind to study ; today I am a good student. The Staff of my college are delighted with my progress.

Dear readers, don't be silly of thinking my beloved to be of blood and flesh. It was just a stick, a beautiful stick I bought from a shop in Karachi. As I have already said, it has its own individuality and because of this I it "Samry" call, meaning thereby juggler's stick. The miracles of this stick were numerous and of some of the most important ones I have already given a brief sketch.

But where has "Samry" gone ? I am ashamed of admitting it is all due to my misfortunes and misdoings. One day I was walking in the college corridor, minus the proper college uniform, with my Samry under my arm. Soofi Sahib saw me and soon I was bereft of this heavenly gift which had produced so many changes in my life. I daily visit Soofi Sahib's room to have a look at my dear Samry. I daily pray to God for the recovery of this precious gift. Now I request Soofi Sahib to have mercy on me and return me my dear Samry. I promise to be a good student and will always respect the rules and regulations imposed by the college authorities and will never come to the college minus any part of the uniform.

THE LION BUSINESS

A SHORT STORY

by

JAAFAR MSOLOMI, II Year

I am on a big rowing boat with six of my best pals. The tropical night will soon close in but we are only a couple of miles from our destination where we intend to make merry for a night or two.

Tonight will be a moonlit night, and from the weather forecast on the radio we hear that the skies have decided to remain crystal clear.

Crowded in the little hold of our vessel are a fat live goat, which I bought for barbecue, a chest full of cold drinks, some packets of sweetmeats and other bits and pieces. On the chest there are our camping outfits, Simba's ukelele, Ali's saxaphone, a small West India treble-headed side drum for Guy, and Dick's guitar.

I'm not as good a singer as Kopa who is a fine treble, and Manju a gripping tenor. But usually when they start singing I join in with my humming bass.

Dick our guitarist is looking rather grim. He wants to play his Hawaiian guitar all the time, which I, being the captain of the party, have forbidden him till we touch the shore. But if he starts playing, he can make a hula girl swing the mean hip like she'd received a free ticket to heaven.

Me! I'm very pleased with everything around me. The lake is calm, except for a gently dying evening breeze blowing in the same direction we are going, but which causes only small crisping ripples.

Gentlemen, sunset can be wonderful. But it can be doubly marvellous when you watch it, holding the rudder under your armpit nearing a sparkling sandy beach. The full moon is peeping, as it is, from behind the eastern hills, while the sun is sinking into the lake in the West. This is the purest of natural romance. And I really enjoy it, I'm telling you!

"Say, Mambo!" says Manju as he watches me, "You don't mean to go back home before we enjoy this night at Wedding Sands, do you?"

"Like hell!" says Dick, "I'm worked up by this damned rowing. I wanna play my Hawaiian on that sandy bank quick and pronto. What's eating you, Captain?"

"Nothing," I say, "except that mother Nature was getting too beautiful for me, and I was carried away by her charm."

I pull the rudder to my side so that the nose of the boat returns in the desired direction The boys make quick thrusts into the water and they pull harder at the oars. Manju starts a lilting chant which we all catch and sing with an enthusiastic tempo. And do we glide!

"Boys!" I announce as the nose of the boat shoves itself into the sand, "you're allowed five minutes to tune up your instruments and two minutes to play one Cha-cha!

"Sure, Boss," cries Dick.

"But after that, no idle hands," I warn, a bit seriously.

They start tuning up. I stroll around, collecting firewood for the barbecue.

But as I am coming to lay down the last load of firewood, I am scared stiff because I have heard a frightening roar not different from that of a lion. I am scared the more when I remember what a famous and experienced African hunter told me once, that the roaring of a stalking lion seems ten miles away when the marauder is actually only a chain away from you. And he does not roar too many times.

Being where we are, at a solitary spot in the heart of Africa, by the side of a deep, ancient, rift valley Lake Tanganyika, it's on the cards that a lion will visit us tonight.

Nevertheless I do not want to spoil our happiness by breaking the horrible news to my ecstatic pals. I only pray these boys have not heard it. Apparently they haven't.

We are sitting near a small hut and there are many like this scattered all over the romantic Wedding Sands, built by itinerant fishermen These people will surely come to use them again when another fishing season comes round.

The seven minutes are over. Music stops.

Before we get busy Kopa says, "What's that? Do you hear anything?"

We all strain our ears, but I also hold my breath, fearing that the game's up at last. Perhaps the boys will soon rush to the boat for their lives.

But it isn't the lion. From out on the lake we can hear distinctly the chuck-chuck of powerful motorboats, and songs and musical instruments. This comes as a great relief to me. By the searchlights we can see that there are three boats coming very fast. But they are still very far.

"I only hope that there're many extra girls on those boats," says Dick.

"What are girls for?" snaps Simba, "If you needed one, why didn't you bring her along with you?"

"You're telling me! And why didn't you bring yours along?"

"Captain said we wouldn't need any. But I could get one any time."

"Sure, you could! We all know of your amorous propensities!"

"Take care, you! what do you mean by that, eh?"

"That's enough, boys," I intervene. "You all know that the local authorities are very strict about girls these days. They're guarding and preserving them like rare species! But the fact is that the girls are being trained for the new film industry.

"Today, nevertheless, most of the would-be film stars are coming to sing and dance for important newly wedded couples, who are to honeymoon here at Wedding Sands. Film shooting will also take place. I learned this from a friend of mine who is the manager of the film company at Vale. That's why we arranged to come here, so that you boys might have fine partners."

"You dont say, Mambo!" they all shout with great expectations.

"And our band will give the best cha-cha-cha tune, because ours is the best band in the country," says Ali.

"That's it," say I, "but in the meantime let's see to our barbecue."

We get very busy. A bonfire is already burning. There are no idle hands. In a few minutes there is plenty of well roasted mutton.

The full moon is shining marvellously. One, just one lonely cloud which came to coronate her in a multi-coloured halo, has gone. And now she is outshining all the other heavenly bodies. This nocturnal queen can be romantic. I bet if that celebrated poet by the name of Sir Philip Sidney were at Wedding Sands tonight, he wouldda composed such line, that wouldda made you feel like flying into the heavens and make love to the Moon, the beauteous and lonely queen!

Me......I'm very jealous of these mugs, these American and Russian know-alls. Because these smart boys have already sent petitions for her hand. And she has accepted both. But because of their out-of-place, earthly law that no two masters can rule one and the same house, they're now wrestling it out so that one should simply watch and act as the best man and the other the groom! O Space supremacy!

I think I've told you people that I love Nature when she decides to show her beauty. But I am going to tell you that I really hate her when she spits her cruel venom on innocent mankind by way of flood and disease, cyclone and thunder, earthquake and war, and, above all, death. Nature can be murderous!

I am right in the middle of my brown study when Simba says, "They've arrived, and what fine babies they've brought!"

"Oh, have they?" I say, getting up. "Be ready, boys. Let's play 'Welcome to Wedding Sands'."

After this the new arrivals help themselves to the numerous refreshments. Dick, Simba, Guy and Ali play an intoxicating lullaby.

Manju and Kopa, the two top singers, are chatting between themselves.

"Say, Manju," says Kopa, "did you see?"

"What?" says Manju.

"Her eyes!"

"Whose?"

"Kaya's."

"Hmm! mm! mm! I wouldn't love her if I were you. You can be sure that your love will go to the rocks. She's certainly the best girl in town. But she looks sober and unimpressed by boys."

"But you said she's a hard-to-get."

"Yeah. But Mambo is the most handsome boy, and is very tough for girls, too!"

Like hell, I am! In fact all I've overheard from Kopa and Manju about the girls and myself is nearly correct. I have decided to remain in the background throughout the function. And, for reasons of my own, I've given instructions to all my boys not to expose my name too much, especially to the girls.

This girl by the name of Kaya is no joke. She has come to the function with her younger brother, just to prove to you that she doesn't want any funny partners. But what is at the back of my mind is that if the right type of boy proves his worth before her, by deed as well as by appearance, she's sure to fall headlong for him.

And I also think that her dream boy is myself. But what remains is to prove to her that I am he !

If you watched her as I am doing from behind people's shadows you'd really feel the snakes in your spine. All my life I've been very cold and unimpressed where the looks and charms of dames are concerned.

But I'm telling you, one and all, that this girl Kaya has got so much to look at that even the notorious old Casanova would certainly wish to take her for a date! Because when they were handing out shares of beauty, Kaya musta been the very first to get hers.

The trouble is, or isn't it, that every boy who ever looks at her is head over heels about her, as they say. And every girl who ever does the same is almost malicious of her.

The dance has commenced again. Couple after another gets up and begin to change their steps in all sorts of ways on the same cha-cha-cha tune. The star girls are practising dancing of a marvellous kind. They put cups and saucers on their heads and leave them sticking there. Then they start shaking their shoulders loosely but in a most lovely way. They stretch and withdraw their necks like a pecking dove. Their feet which move with magic tricks are another story. In fact each and everything on these girls is moving just the right way. Jove ! What a fine spectacle Kaya is ! This girl is tops.

Any way, gentlemen, that's how I've come to watch what they call these days as cha-cha cha, a kind of dance from Jamaica, Cuba and all, and which is derived from what used to be called by my name—Mambo

Again the orchestra strikes up the hottest honeymoon cha cha-cha. The music from the saxaphone is very good and I get interested. But in the middle of it all, I can distinctly hear once again the same far away roaring of a lion.

I get up. I'm very worried because now all the lives of these young things are on my shoulders. Besides there is my own sweet life to consider.

I go stealthily and meet my friend, the Manager, who's busy giving instructions to his engineers. I pull him aside.

"Mr. Manager," says I, "supposing we all get on to the boats and the orchestra plays while we're floating, for some time, just for a nice change ?" I'm careful not to terrify him by the idea of the scheming lion who is now just behind the sand-ridge.

"A good idea," he says. "But the cameras will not cover the actions of the major part of the function. If you're particularly anxious to have a change, you can have the band and half my people, in two boats. The rowing boat should be simply floating while the motor boat should be encircling it. The rest will remain on the sand. The cameramen who will cover these activities will remain with myself there, near the hut."

"O K., Manager," I say, "By the way, have you brought a gun with you ?"

"What for, Mambo ? " he tells me Why don't you be your age, and try to cooperate ? We don't want any shooting here."

Well, I decided not to argue any further. Because I just want to find out whether a lion can dance to a cha-cha tune at the ball, or whether he will pick the best looking girl from the honeymoon party and run away with her into the jungle !

The first situation would be an unprecedented marvel which only very courageous people like myself would enjoy watching, much less participating in. While the other would be such a grievous one that only very hard-hearted people like myself would not shed a tear.

So, now I'm on the horns of a dilemma, as they say. And my solution of it is not found in any book of logic. If I take the obvious course of breaking the news, it may result in more chaos and injuries. What's more, should the lion prove harmless, or should there be no lion at all, I may come to be regarded as a chicken, by the girls. This I'm not prepared for. No, Sir ! I'd rather have the lion, if he be, dance with a girl at the party. Of course not with Kaya !

The music stops, the party is dividing according to the Director's suggestion. He and his party of moving cameramen, with a few of their tape recording machines, go to the other side of the hut so that everything else can be brought into focus.

Kaya, with one or two other girls, is going to put her little brother to bed in the grass.

I get on to the motor boat, rather brooding over what the hell would break up next. An exciting fox-trot is struck up simultaneously by both the company's band on the land and my band on the boat

The gentle evening breeze has veered round. Now the midnight gale is blowing pretty hard. The bonfire is burning, as if somebody had poked it. The moon is as bright as ever.

I gaze anxiously at the hut, over it and beyond it. A few isolated glow-warms are dimly emitting their unimpressive light as they fly from bush to bush...............But........... twinkling from behind the sand ridge, twenty yards from the hut two......... eyes...........yes two eyes.............. And

> "What is this life, if full of care,
> We have no time to stand and stare."

I feel very sorry for Kaya, her brother, and the other two girls who entered the hut.

Suddenly Kaya comes out of the hut, almost triumphantly. She stretched out her shapely limbs apparantly to drive out the kinkles from the joints ; gracefully like a cat stretching herself full length after a night's nap. Then......O Lord...... save Kaya !...O God have mercy...!!

I hold my breath. The lion makes the most terrible frog-jumps I've ever seen......and he lands five or six yards from Kaya. The girl just falls back into the hut. I can see that somebody is struggling to close the door.

Apparently none else knows that Kaya and Co. are trapped in the hut by the stalking beast, except myself and the beast.

The lion starts roaring angrily. The music stops. The girls are shrieking. Some of them have fainted. I can see that the boys on the land are collecting the girls and placing them in the remaining boats, all in a heap as if they were bags of some delicate material.

Me ! I quite agree that a beautiful dame can be the source of your happiness. But you will also agree with me that a girl, however beautiful, in time of emergency, like this lion business, is really a piteous and hopeless thing indeed. She just flops and it's all over with her. And it's at this time that she'll call you Sir ! And she'll be your slave, your baby, in fact, to her you're her life ! I'm telling you !

The manager in the last man to enter the boat. Many things have been left on the sand, including the moving camera which is going click-click all the while.

The lion now is getting furious. If he breaks the door of the hut, he'll enter the hut like an expected guest. And I wonder how Kaya would receive him !

The beast however decides to make another terrible jump ; this time on to the roof of the hut. Fortunately it doesn't give way under his weight. And he's very furious about it. He therefore starts unroofing the thatch and consciously or unconsciously throws it on to the fire. Presumably he doesn't want to devour his prey in man-made light. But in doing so he actually adds fuel to the bonfire. Yet he still throws the roof grass on to the fire which is now dangerously creeping towards the hut.........It ......is......hell !

"Ladies and gentlemen," cries the company Director and Manager, "is everybody on board ? Is Kaya here ?" No answer.

Well Mambo, say I to myself, here is your chance to prove that you're her dream boy, her saviour, that you are he !

I strip off my party suit. Thank God I have my swimming dress on. I make a headlong dive. The tropical lake water is pleasantly cool at this early hour of the morning. I almost enjoy the swim.

On reaching the shore I look back. Everybody is watching me. Some girls are hiding their pale but pretty faces in the palms of their hands.

The manager who has now understood the horror of the situation is likewise stripping off his well-cut suit. He wants to follow me.

"Don't manager, till I call you," I shout to him. "But you can steer one motor-boat near the shore."

So saying, I pick up a piece of wood and run towards the hut. The fire is starting to consume one corner of the hut. But the lion is still on the roof, growling and roaring thunderously. He hasn't seen me.

I throw a piece of wood which touches him just near the tail. On seeing me he makes the most frightening leap I've ever seen.

The hungry man-eater is on me. I wait a bit, purposely. Then I show him my heels and run in a zigzag way, like the Zengakure snake-dance, just to tempt him the more. Then I finish the race by plunging once more into the lake. The lion follows. And boy, oh boy ! can the lion swim or can he ? You can bet that he just misses my neck when I make the duck trick and dive.........

A lion can't dive. He keeps his ugly blowing nose half a dozen inches above the surface of the water. The manager's motor-boat comes to my rescue. Fortunately he has a heavy native axe. He swings it round and above his head, and lets it land on the lion's nose with a bang. The beast breathes with great difficulty and he's ultimately drowned.

I haven't watched all the details of the death of the lion. Because I'm already in the death-hut. Kaya is on all fours near the door. Sitting behind her is her little brother with a death-like expression spread all over his face I gather both of them in my arms and place them outside the burning hut.

I try to free myself from the brother and the sister, so that I may go to save the remaining girls. But the brother leaves me, while the sister doesn't. Over Kaya's head I see the manager and many other boys running towards us. They're just in time to save two helpless girls.

The moving cameras are still clik-clicking. Kaya's warm body against mine vibrating with sobs of happiness. She looks as me in that sorts way that wouldda made you feel that you were the hero of the seven heavens.

She smiles and the glow of her expression outshines that of the moon. All my little life I've been reluctant to yield to a girl's smiles and winking, and I'hve seen many. But you couldn't do that when Kaya smiled and pulled at you.

The orchestra is playing "Good-Bye to Wedding Sands !"

"What's your name, sweet ?" says Kaya to me.

"No ! My names's not sweet," I tell her, "I'm Sodium Cloride !"

"Pardon ?"

"Common salt."

"Jeez ! Why ?"

"Because, without him you wouldn't live".

"You're telling me !" she laughs.